

سیاتلہ ندوۃ المصنفین دہلی  
(۱۱)

DATA ENTERED

# وہی اہلی



تالیف  
سعید احمد ایم، ایے



سلسلہ تہذیب المصنفین

(۱۰)

# وحی الہی

مسئلہ وحی پر پہلی محققانہ کتاب جس میں وحی کی لغوی اور شرعی حقیقت،  
وحی کے اقسام، وحی کی حقیقت جدید فلاسفہ مغرب کے نزدیک  
خدا کی صفت کلام، بلکہ نبوت اور استعداد وحی نزول وحی کی نوعیت و  
کنیت، قرآن مجید کے وحی الہی ہونے کے دلائل، اعجاز قرآن، وجود  
اعجاز کی تفسیح، ان تمام عنوانوں پر بصیرت اور ذکاوت کیا گیا ہے

تالیف

(مولانا سعید احمد اکبر آبادی ایم اے)

میںخزندۃ المصنفین کے اہتمام سے

جدید برقی پریس ملی میں طبع ہوئی

۱۳۶۰ھ

۶۱۹۴۱

✓  
۲۹۷۵۱۱  
۱۲۳۰

U. P. III 21  
18363

حقوق طبع ندوۃ المصنفین کے لئے

محفوظ ہیں

# فہرست مضامین وحی الہی

صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان	صفحہ	عنوان
۶۲	شکرین کے اعتراضات کی تردید	۳۶	ایک سوال اور اس کا جواب	۵	پہلے کی ضرورت
۶۶	حضرت جبریل کی توثیق	۳۸	مزید شرح	۷	دل کی کوتاہی
۷۷	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق	۴۰	یہ آواز کس کی تھی	۸	اسفہ کا اعتراض عجز و نارسائی
۷۸	قرآن کا اقرار کیا ہی نہیں جاسکتا	۴۲	تمثیل یعنی فرشتہ کا کسی	۱۰	نفل اور دل
	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے	۴۲	انسانی شکل میں آنا	۱۲	رجبات تسکین و یقین
	متعلق قرآنی تصریحات	۴۳	فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا	۱۵	وحی کے لغوی و اصطلاحی معنی
۸۲	قرآن آپ کے قلب پر نازل ہوا	۴۶	علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری کی تقریر	۲۳	وحی اور الہام کا فرق
"	روح محفوظ کا بیان	۵۴	چھٹا طریقہ وحی	۲۶	وحی کی حقیقت
۸۳	قرآن کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے	"	ساتواں طریقہ وحی	"	امام غزالی اور دوسرے مسکین
	قول بشر کہنے پر عذاب و دوزخ		آنحضرت اور مسئلہ رویت		کی آراء
۸۵	کی وعید	"	بارہی کی تحقیق	۲۷	ابن سینا کی رائے
	قرآن مع عربی الفاظ کے	۶۱	قرآن اور وحی	۲۸	حافظ ابن تیمیہ کی رائے
۸۶	وحی الہی ہے		قرآن کے منزل من اللہ	۳۰	وحی کی مختلف صورتیں
۸۷	تنقیحات و نتائج	۶۱	ہونے پر توحیدی	۳۱	روایے صادقہ
	خدا کی صفات ذاتیہ پر		بعض جزئی داغحات سے		روایے صادقہ سے آغاز وحی
۹۰	ایک عام بحث	۶۳	استدلال		کی حکمت
۹۳	صفات کی حقیقت		عدم اختلاف کے قرآن کے منزل	۳۲	نفس فی الروح
۹۵	صفت ذات اور صفت فعل	۶۸	من اللہ ہونے پر استدلال	۳۳	صلصلہ البحرین
۹۶	تعدد صفات اور وحدانیت ذات		اہل کتاب قرآن کے منزل من اللہ	۳۴	اس حالت کی شدت
۹۸	صفات کا ظہور و حادثہ میں	"	ہونے سے باخبر ہیں	۳۵	

۱۲۳	واقعات آئینہ کی پیشینگوئی	۱۰۰	مراتب کمال و نقص کا تفاوت	۱۰۰	صفات لائین والا غیر ہیں
"	غلبہ روم کی پیشینگوئی	۱۰۱	استکمال و تکمیل	۱۰۱	حوادث کا قیام ذات باری سے
۱۲۴	جنگ روم و ایران کا واقعہ	۱۰۳	فکر و حدس	۱۰۳	ایک تہنیه
۱۲۵	ایرانیوں کی فتح	۱۰۶	عقل کے مراتب متفاوتہ	۱۰۶	کلام الہی
۱۲۸	مشرکین مکہ کی مسرت	"	ملکہ نبوت وہی ہو کسی نہیں	"	قرآن مع الفاظ کے کلام الہی ہے
۱۲۹	کفار مکہ کا استبعاد اور	۱۱۱	ایک اور نظریہ	۱۱۱	کیا کلام کے لئے لفظ ضروری ہے
۱۳۵	اس کی وجہ	۱۱۳	نبی کی بشریت	۱۱۳	زبان حال کی وسعت گویائی
۱۳۸	پیشینگوئی کی صداقت کا ظہور	"	وحی اور محققین یورپ	"	قرآن مجید میں خدا کی صفت
۱۳۹	چند اور پیشینگوئیاں	۱۱۳	عجائب تحقیق	۱۱۳	کلام کا ذکر
"	نصاحت و بلاغت	۱۱۵	سلسل وحی اور	۱۱۵	کلام صفت کمال ہے
۱۴۸	نصاحت و بلاغت ذوقی د	"	نزول جبریل	"	خدا کلام کرتا ہے
۱۴۵	وجدانی چیز ہے	"	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	"	خدا اپنی شان کے مطابق
۱۴۸	بلخار و شعرا عرب پر قرآنی	۱۱۶	کا حزن و ملال	۱۱۶	کلام کرتا ہے
۱۴۶	بلاغت کا اثر	۱۱۷	فترت کے بعد نزول وحی اور	۱۱۷	خدا نذا کرتا ہے
۱۸۲	عدم اختلاف	۱۱۸	اس کا تسلسل	۱۱۸	قرآن اور لفظ ربانی
۱۸۵	احکام و شرائع	۱۱۹	وحی غیر متلو	۱۱۹	انسانوں سے کلام الہی کی
"	قرآن کا محکم دستور العمل	"	قرآن مجید وحی الہی	"	صورتیں
۱۸۸	قرآن کی روح سے تشبیہ	۱۲۰	کیوں ہے	۱۲۰	دعا کا ان بشران بکلمہ لا اوجیا
"	حضرت علی کا ارشاد	"	وصف اعجاز	"	کی تفسیر
"	قرآن مجید کا اسلوب	"	وجہ اعجاز	"	آیت کی تفسیر میں علامہ سید محمد
۱۸۹	بیان اور بعض عیسائی	۱۲۰	آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم	۱۲۰	انور شاہ کی تقریر
"	مصنفین	۱۲۲	کی آیت	۱۲۲	ملکہ نبوت اور وحی
۱۹۱	اشعار موضوعہ کی تنقید	"	واقعات غیب	"	حکمت

## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

دُنیا میں سینکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب میں انسان سب کچھ کہنے کے بعد آخر امر ایک ایسے مرحلے پر پہنچتا ہے کہ پھر اُس کے لئے جواب کی کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ ہاتھی اس قدر فریب اور ڈانا کیوں ہے؟ چوٹی کیوں اتنی نجیف و زار ہے؟ آم کے درخت پر آم ہی کیوں لگتے ہیں یا مینیں کیوں نہیں پیدا ہوتیں! غم سے رونا اور خوشی سے ہنسنے ہی کیوں آتا ہے۔ اس کا برعکس کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اور اس طرح کے سینکڑوں سوالات ہیں جن کے جواب کا آخری مرتبہ یہ ہے کہ ان عام چیزوں کو اشیاء کے طبعی خواص اور اُن کے نوعی مختصات پر محول کر دیا جائے، پھر اگر اس کے بعد بھی یہ سوال کیا جائے کہ اس شے کی یہ طبعی خاصیت کیوں ہے اور یہی کیوں ہے۔ کوئی اور چیز کیوں نہیں؟ تو اس کے جواب میں ایک ملحد کہے گا کہ مادہ کی ترکیب اسی طرح ہوئی ہے۔ لیکن موجد جواب دے گا کہ خدائے ہر شے کی صورتِ نوعیہ میں ایک الگ خاصیت رکھی ہے۔ جواب دونوں کے مختلف ہوں گے لیکن ہر ایک کا یہ جواب ایک آخری جواب ہو گا کہ اگر اس کے بعد بھی سائل کیوں سے سوال کرے تو اس کے جواب میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

وحی کا مسئلہ اسی طرح کے مسائل میں سے ہے۔ اس کی حقیقت کے سمجھانے میں ہم تباہ کئے ہیں کہ خدا کلام کرتا ہے۔ خاص خاص انسان (انبیاء) اُس کا کلام سنتے اور سمجھتے ہیں۔ اور ہم یہ بھی کر سکتے ہیں کہ ان دعوؤں پر جو عقلی اعتراضات کئے جائیں اُن کو رفع کر دیں، لیکن اس کے بعد بھی اگر کوئی

شخص ”ایسا ہی کیوں ہوتا ہے“ کہہ کر ہم سے سوال کر گیا تو اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ اچھا ہے تم ہمارے ہزاروں ”کیوں“ کا جواب دیدو۔ پھر ہم بھی تمہیں سمجھا دینگے کہ خدا انبیاء میں ہی کیوں کلام ربانی کو سمجھنے کی استعداد رکھتا ہے ہمہ تن میں کیوں یہ صلاحیت نہیں ہوتی۔

زیر نظر کتاب میں وحی الہی پر جو بحث کی گئی ہے اس کا مقصد انہیں سوالات کا جواب ہے جو واقعی ایک طالب تحقیق کے دل میں اس مسئلہ پر غور کرنے کی راہ میں پیدا ہو سکتے ہیں ان کے وہ لوگ جو ازراہ بغض و عناد اپنے ”کیوں“ کا سلسلہ کہیں ختم ہی نہیں کرتے وہ اسکے مخاطب نہیں ہیں ان اوراق میں کوشش کی گئی ہے کہ قرآن مجید کی بیان کردہ حقیقت وحی کو عقلی اور قلبی حیثیت سے عام فہم انداز بیان کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔ یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہو سکتی ہے؟ اس کا فیصلہ ارباب نظر و خبر کریں گے وَاللّٰهُ هُوَ الْمُسْتَعَانُ وَعَلَيْهِ التَّكْلَانِ

سعید احمد اکبر آبادی

ندوة المصنفین دہلی

۳۱ اگست ۱۹۴۱ء



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

الحمد لله وكفى سلا م على عباده الذين اصطفى

## وحی کی ضرورت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو اشرف المخلوقات بنایا۔ زیر علم و عقل سے آراستہ کیا۔ اور اس نے انسان کے جہانی نشوونما اور اس کی مادی زندگی کی ترقی و فلاح کے لئے کارگاہ ہست و بود کو رنگ رنگ کے نقش و نگار سے سجایا اور ابن آدم کی تربیت و کامرانی کے لئے ایک مخصوص نظام کے ماتحت قطعی و حتمی وسائل معیشت پیدا کئے۔ چنانچہ وہ پانی پیتا ہے، ہوا میں سانس لیتا ہے۔ بادلوں سے بارش ہوتی ہے جو اس کے کھیتوں اور باغوں کو سرسبز و شاداب کر دیتی ہے اور جس سے اناج اور پھل پیدا ہوتے ہیں۔ آگ سے وہ اپنی غذا تیار کرتا ہے۔ آفتاب کی دھوپ سے حرارت پیدا ہوتی ہے۔ یہ سب چیزیں جن کی تخلیق میں انسان کی صنعت و حرفت کو کوئی دخل نہیں ان پر ہی حیات انسانی کے قیام و بقا کا دار و مدار ہے۔ یہ تمام اشیاء وہ ہیں جن کو مادی زندگی کے قدرتی وسائل و ذرائع کہا جاتا ہے، لیکن اس مادی زندگی سے بڑھ کر انسان کی ایک اور زندگی ہے جس کو روحانی اور اخلاقی زندگی کہتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے کوئی شخص ابھکا رہ نہیں کر سکتا کہ یہ ہی وہ اصل حیات ہے جس پر انسان کی اجتماعی زندگی کا صلاح اور درست نظام قائم رہ سکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو انسان کی تمام تمدنی ترقیات، عمرانی ایجادات و اختراعات، اور عقلی تحقیقات و اکتشافات

انسانیت کی تعمیر میں مفید ثابت ہونے کے بجائے خود اس کے لئے ہم قاتل بن جائیں اور اسکی سوسائٹیاں  
 وحشیوں اور زندوں کے میس ریوڑ کی شکل میں تبدیل ہو کر رہ جائیں۔ جس طرح پوسے نظام شمسی کے قیام و بقا  
 کا دار و مدار اجرام فلکی کے باہمی جذب و انجذاب پر ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسانی سوسائٹی کے نظم و نسق  
 اور اس کی فلاح و نجات کا انحصار حاسہ اخلاقی یا روحانی اعمال و ضوابط پر ہے۔

اس بنا پر یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ رب العالمین جن نے انسان کی مادی و جہانی زندگی کے قرار و

قیام کا خود مکفل کیا۔ اس کے لئے ایسے قدرتی وسائل و ذرائع پیدا کئے جن کی صنعت و تخلیق میں انسان

کے اپنے دستِ ایجاد کو مطلقاً دخل نہیں ہے۔ وہ ہیں اخلاقی اور روحانی زندگی کے ایسے قدرتی اصول و

آئین نہ بتانا جو صالح تمدن کے اساس و بنیاد بنیں اور جو قطعی و حتمی ہونے کی وجہ سے ہر ملک اور ہر زمانہ میں

ہر شخص کے لئے لائق عمل اور درخور قبول و پذیرائی ہوں۔ اور ان میں کسی کے لئے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔

عقل کی کوتاہی | کہا جاسکتا ہے اس طرح کے اصول و ضوابط کے لئے یہ کیا ضروری ہے کہ وہ خدا کے بنائے

ہوئے ہوں۔ اور اس نے ہی انسان کو ان کی تلقین کی ہو۔ جس طرح انسان اپنے رہنے کے لئے مکانات

بناتا ہے۔ گرمی سردی سے محفوظ رہنے کی غرض سے اپنے لئے کپڑے بناتا اور تیار کرتا ہے اور اسی طرح کی

ہزاروں صنعتیں اس نے اپنے نفع کے لئے ایجاد کر رکھی ہیں۔ وہ یہ بھی کر سکتا ہے کہ اپنے لئے اخلاقی ضوابط

و قواعد بنائے اور اپنی روحانی تشنگی کو فرو کرنے کے لئے خود ہی کوئی نسخہ کیسے تیار ہو کر لے، عقل جس طرح

مادی ترقی کی راہ میں رہنمائی کرتی ہے، اخلاق اور روحانیت کے میدان میں بھی وہ اسی طرح شمع ہدایت

لے ڈاکٹر اقبال مرحوم نے یورپ کی عقلی ترقیات کا اسی بنا پر نہایت بیخ پر ایہ میں تم کیا ہو کہ وہاں ان سب ترقیوں کے باوجود اخلاق

اور روحانیت کا فقدان ہو اور اس لئے انسانی زندگی کا شیرازہ اطمینان سکون حد درجہ پر اگندہ و پریشان ہے۔ فرماتے ہیں:-

جس نے سوج کی شاعروں کو گرفتار کیا      زندگی کی شب تار یک سحر کر نہ سکا

ڈھونڈھنے والا سازوں کی گذر گاہوں کا      اپنے انکار کی دنیا میں سحر کر نہ سکا

بن سکتی اور اُس کا ناخن تدبیر دونوں جگہ مشکل اور پیچیدہ مسائل کی گرہ کشائی میں کارگر ثابت ہو سکتا ہے لیکن  
 اس کا جواب یہ ہے کہ کسی انسان کی عقل کتنی ہی کامل و مکمل ہو نقص سے متبرک نہیں ہو سکتی۔ انسان خود اپنی فطرت  
 و طبیعت کے اعتبار سے ناقص و غیر مکمل ہے۔ اس بنا پر اُس کی کوئی قوت بھی خواہ ظاہری ہو یا باطنی، مادی  
 ہو یا روحانی، من کل الوجوه کامل نہیں ہے۔ ہر معاملہ میں صحت کے ساتھ خطا، کمال کے ساتھ نقص، اور تذکر کے ساتھ  
 سہو و نسیان کا خدشہ لگا ہوا ہے۔ اور کیوں نہ ہو، امکان و حدوث کی ظلمت کے ساتھ کمال بے خطا کا نزوح  
 کس طرح ہو سکتا ہے۔ جس طرح انسان رنگ اور شکل میں ایک دوسرے سے متباہن ہیں ٹھیک اسی طرح اپنے قوائے  
 فکر یہ و باطنیہ کے لحاظ سے بھی وہ مختلف اور ایک دوسرے سے جدا ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی خوش نصیب  
 عقل حقیقت کے بجز ناپیدا کنار میں غوطہ زنی کر کے صداقت و حقانیت کے چند آبدار موتی حاصل کر لے  
 لیکن اُس کے پاس وہ قوت کہاں ہے جن سے وہ تمام دنیا کو اُس صداقت کا معترف بنا سکے۔ کوئی  
 انسانی اختراع و ایجاد خواہ کتنی ہی حقیقت سے قریب ہو، اختلاف کی گنجائش سے خالی نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ  
 ہے کہ عوام کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ آج تک دنیا کی ممتاز عقلیں بھی کسی ایک مسئلہ پر متفق الراضے نہ ہو سکیں فلسفہ  
 یونان کے جو بنیادی نظریے تھے اور جو قریباً قرن تک عالم میں مقبول و رائج رہے، آخر آج موجودہ فلسفہ  
 یورپ نے اُن کو پرزہ پرزہ کر کے فضا میں منتشر کر دیا ہے۔ لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ آج فلسفہ حال کی عمارت  
 جس بنیاد پر کھڑی ہے مستقبل میں کوئی قوم اپنے جدید نظریات و افکار کی قوت سے اُسے پاش پاش نہیں  
 کر دیگی اور اُس عمارت کے کھنڈروں پر ایک نئے نظام فکر و عمل کی دنیا نہیں بسائیگی۔ قرون اور صدیوں  
 کے بعد جو کچھ ہو گا اُسے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ لیکن اتنا تو اب بھی دیکھا جا رہا ہے کہ فلسفہ جدیدہ کی شان دار  
 عمارت کو ارتیاب و شک کا گھن ابھی سے لگنا شروع ہو گیا ہے۔ مولانا عبدالباری ندوی استاد فلسفہ جدیدہ  
 عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد دکن "فہم انسانی" کے مقدمہ میں اس رازِ سرلبتہ کا انشا اس طرح کرتے ہیں۔  
 "اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد جدید فلسفہ کی تاریخ زیادہ تر نام بدل بدل کر کھلے یا چھپے آوازِ جہل

کی تاریخ بن کر رہ گئی۔ لاک کے یہاں یہ اقرار حیات کے نقاب میں ہے اور برکٹ کے اس واقعے  
تصویریت کے، مگر اتنی باریک اور شفاف کہ ردِ پیشی سے زیادہ ورنہ انسانی کی زینت ہے، آخر  
برکٹ کے بعد ہی ڈیوڈ ہیوم نے اس رونا نقاب کو بھی تار تار کر دیا اور نہ صرف جبلتِ ارتیابیت  
کا کھل کر اقرار کیا بلکہ اپنے کو ارتیابی ہی کہلانا پسند کیا۔

فلاسفہ کا اعتراف عجز و نارسائی | عقلِ انسانی کی کوتاہی اور اُس کے عجز و قصور کا ثبوت اس سے بڑھ کر کیا ہوگا  
کہ وہ عظیم المرتبت فلاسفہ عالم جن کے فلسفیانہ افکار و نظریات عقل و فکر کی تاریخ ارتقار کا آخری نقطہ عروج اے  
جاتے رہے ہیں۔ جب عالم حقیقت کی لامحدود وسعتوں میں انھیں قدم قدم پر حیرت و گشدرگی سے سابقہ پڑا تو خود  
انھیں بھی عجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہ تھا کہ وہ بر ملا عقل کی کوتاہ بینی اور فکر کی نارسائی کا اعتراف کریں  
تقریباً کا یہ مقولہ حد تو اترا تک مشہور ہے، "ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے" انگلستان کا مشہور فلسفی  
ڈیوڈ ہیوم صاف لفظوں میں اقرار کرتا ہے کہ

”انسان عقل مخلوق ہے، اور اس لحاظ سے علم اس کی خاص و داخلی غذا ہے لیکن ساتھ ہی  
انسانی ذہنی عقل و فہم کے حدود اتنے تنگ ہیں کہ اس باب میں اس کو دست و اذعان  
دونوں حیثیات سے بہت ہی کم اپنے فتوحات سے تشفی نصیب ہو سکتی ہے۔“  
”فہم انسانی میں ہی ایک اور جگہ فلسفہ کا اس طرح مذاق اڑاتا ہے۔

”مکمل سے مکمل فلسفہ طبعی بھی صرف یہ کرتا ہے کہ ہمارے جبل کو ذرا اور دور کر دیتا ہے جس  
طرح مکمل سے مکمل فلسفہ مابعد الطبیعیات اور اخلاقیات کا صرف یہ کام ہوتا ہے کہ ہمارے اس  
جبل کے وسیع حصوں کی پردہ درسی کر دیتا ہے، مطلب یہ ہے کہ فلسفہ اسرار کائنات کی نہیں  
صرف ہمارے جبل کی پردہ درسی کرتا ہے۔ اس کا حاصل اگر کچھ تھا یا ہو سکتا ہے تو انسان  
کی کمزوری اور کورچی کا تاشاد و یکناد کھانا جس سے بھاگنے کی کوشش کے باوجود بار بار

دوچار ہونا پڑتا ہے۔

ہیوم تو خیر ارتیا بی تھا۔ ہر چیز کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، مادہ پرستوں کا ابوالابار و میقراطیس

(متولد ۱۲۶۰ ق م) تک کا قول ہے کہ کوئی بات سچ نہیں اور اگر ہے تو ہم کو معلوم نہیں۔

پس جب عقل خود ناقص ہے تو کسی صحیح نتیجہ تک پہنچنے کے لئے جو ذرائع اختیار کئے جائیں گے

یعنی قیاس استقراء اور تمثیل ان کی نسبت کیونکر بو ذوق کہا جاسکتا ہے کہ وہ کسی صحیح اور یقینی نتیجہ تک ہماری

رہنمائی کر سکتے ہیں

یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کے یقینی علم کے لئے مشاہدہ سے بڑھ کر کوئی اور قوی دلیل نہیں ہو سکتی۔ لیکن

آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ قدیم فلاسفہ میں تو لا اور یہ کا ایک مستقل گروہ تھا ہی جو کہا کرتا تھا کہ ہمیں کسی شے

کی کوئی حقیقت معلوم نہیں۔ یورپ کے جدید فلاسفہ کی صفت میں بھی برکے جیسے فلسفی نظر آتے ہیں جو کہتے ہیں

کہ کسی شے کا وجود صرف وہی ہے جو ذہن میں ہے اس کے علاوہ وجود خارجی کے کوئی معنی نہیں۔ اس سے

ہمارا مقصد یہ نہیں ہے کہ ان فلاسفہ نے جو کچھ کہا وہ ٹھیک ہے۔ بلکہ مدعا صرف یہ دکھانا ہے کہ اگر عقل کو آزاد

چھوڑ دیا جائے اور خدا کی ہدایت اس کی دشگیری نہ کرے تو خود اس کی کوششیں بسا اوقات فرط حیرت

کی ناکامی و بایوسی پر منتہی ہوتی ہیں اور ادراک حقیقت کی کسی روشنی تک پہنچنے کے بجائے وہ علمی و نادانی

کی تاریکیوں میں خود اپنے آپ کو بھی گم کر دیتی ہے۔

اس موقع پر اتنی بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ جب طبیعیات میں عقل کی کوتاہی کا یہ عالم ہے کہ

وہ قطعی طور پر کسی چیز کی ذاتیات اور عرضیات میں بھی امتیاز نہیں کر سکتی اور اسی بنا پر ارباب منطق تسلیم

کئے ہیں یہ ظاہر کرنا ضروری ہے کہ اس باب میں جن فلاسفہ کے اقوال نقل کئے گئے ہیں وہ سب فہم انسانی سے ماخوذ ہیں جو

پروفیسر عبدالباری ندوی کے قلم سے ڈیوڈ ہیوم کی کتاب ہیومن انڈر سٹینڈنگ کا بنیاد عمده ترجمہ ہے اس کے علاوہ

موصوف کی دو اور کتابیں "برکے" اور "مبادی علم انسانی" جو برکے کی کتاب کا ترجمہ ہے یہ دونوں بھی پیش نظر رہی ہیں۔

کراتے ہیں کہ کسی چیز کی بھی حد تمام بیان کرنی ناممکن ہے، تو ظاہر ہے ابعداً الطبیعیات میں اُس کی ننگ پائی کا کیا حال ہوگا۔ اور چونکہ فضائل اخلاق اور روحانی کمالات کا تعلق ایک بڑی حد تک حقائق ابعداً الطبیعیات کے تصور سے ہے۔ اس لئے عقل اس راہ میں ہماری کامیاب رہنما ثابت نہیں ہو سکتی اور نہ ہم اُس پر اعتماد رکھ سکتے ہیں۔

عقل اور دل | اس مقام پر مزید توضیح و تشریح کی غرض سے اتنا اور یاد رکھئے کہ انسان کو جتنے معاملات پیش آتے ہیں، ان کا تعلق صرف عقل سے ہوتا ہے یا فقط دل سے۔ اور یادوں سے اور یہ واقعہ ہے کہ انسانی زندگی کا قیام و بقا، اور اُس کی روحانی و اخلاقی دنیا کا نظم و نسق منبہی ہے اس بات پر کہ انسان عقل اور دل دونوں سے کام لے، کیونکہ جس طرح عقل مصدرِ شعور و احساس ہے۔ اسی طرح جذبات و عواطف کا سرچشمہ ہے۔ اگر ہم عقل (Reason) کے ہی تابع فرمان ہو جائیں اور دل (Feeling) کو ہم پر کوئی دسترس حاصل نہ ہو تو ہم اُس فلسفی کی طرح ہو کر رہ جائیں گے جس کو شادی میں غم۔ اور غم میں شادی کی تصویر نظر آتی ہے اور جو اپنی ہستی کے قطرہ کو وجودِ ابدی کے بحرِ ناپید اکنار میں فنا کر دینے کے بعد ہر قسم کے فعل و عمل سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہم عقل سے بالکل صرف نظر کر لیں اور اپنے تمام معاملات اور افعال و اعمال دل کے میلانات و عواطف کے تابع بنالیں تو اس کا انجام بھی بجز تباہی کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس وقت ہماری مثال انتہائی عیش پرست اور ظالم و جابر انسان کی سی ہوگی۔ یا پرلے درجہ کے مغلوب و مجذبات نرم خوار اور ہر آگین شخص کی سی۔ غرض یہ ہے کہ دونوں صورتوں میں خیالات و احساسات کا توازن مفقود ہو کر انسانی اجتماعیات کے شیرازہ کو درہم بہم کر کے رکھ دیگا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ دونوں میں ارتباط و التیام ملحوظ رکھا جائے۔ لیکن محبت کے عام نفسیاتی قانون کے مطابق دونوں میں سے کسی ایک کو دوسرے کی طرف نسبتاً زیادہ مائل ہونا چاہئے۔ اس مرحلہ پر ہمارا دعویٰ ہے کہ عقل کو ایک بڑی حد تک "ادب خوردہ دل" ہونے کی ضرورت ہے جیسا کہ پہلے معلوم ہو چکا ہے عقل محض کی رہنمائی ہمارے لئے کثرتِ کار کا قابلِ اطمینان ذریعہ نہیں۔ البتہ وہ عقل جو علامہ اقبال مرحوم کے

بقول "ادب خوردگی دل" کے زیر سے آراستہ ہے وہ ہماری روحانی تشنگی کو فرو کرنے کا بہت کچھ سامان رکھتی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

نقشہ کہ بستہ ہمہ اوہام باطل ست      عقلے ہم رساں کہ ادب خوردہ دل ست

ذیل کے شعر میں بھی انہوں نے اسی حقیقت پر روشنی ڈالی ہے۔

یامردہ ہے یانزع کی حالتیں گرفتار      جو فلسفہ لکھانہ گیا خون جگر سے

فلسفہ اشراق جن لوگوں نے تاریخ فلسفہ کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جب مسیحیت اور فلسفہ معض دونوں

انسان کی روحانی تشنگی کے فرو کرنے میں ناکام ثابت ہوئے جس کی وجہ یہ تھی کہ مسیحیت عقل کو مطمئن کرنے میں

ناکامیاب رہی۔ اور فلسفہ روح اور دل کے لئے کوئی سامان سکین فراہم نہیں کر سکا، تو افلاطون کے تبعین نے

فلسفہ اور مذہب دونوں کی آمیزش سے ایک معجون مرکب تیار کی جسکا نام فلسفہ اشراق (Neo-Platonism)

رکھا گیا۔ اس کا دائرہ اتنا وسیع تھا کہ طبیعیاتی مسائل و مباحث کے ساتھ ساتھ اخلاقیات اور الہیات اور

روحانیت کے مسائل بھی اس میں شامل تھے۔ فلسفہ کے اس نئے اسکول کا بانی فلاطینس (Plotinus) تھا

جو ۲۰۴ء میں مصر میں پیدا ہوا اور ۲۷۲ء میں روم میں انتقال کر گیا۔

اباب و عقل خود کچھ بھی ہوں لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اس فلسفہ کو مشرق میں اور مغرب میں دونوں جگہ

بہت فروغ ہوا اور غالباً یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ ایشیا کے دل و دماغ پر تو اس فلسفہ کا اتنا زبردست استیلا

ہوا کہ مذہبی عقائد کی مضبوط بنیادیں تک متزلزل ہو گئیں۔ لیکن چونکہ اس فلسفہ کا تمام تار و پود عقل کی نورسگانیوں سے

ہی تیار ہوا تھا اور اگرچہ اس میں ضمیر (کانشنس) کی پکار کو بھی دخل تھا، لیکن وہ منسوب تھی۔ اور غلبہ عقل کو ہی

تھا۔ اس لئے معرفت الہی حاصل کرنے کے میدان میں انہیں قدم قدم پر ٹھوکر سیں کھانی پڑیں۔ اور یہ وہ نوردان

حکمت و دانائی جانفروشانہ تگ و دو کے بعد بھی اس سرخشمہ ہدایت تک نہ پہنچ سکے جو روح اور دل کے

Encyclopaedia of Religion & Ethics

v. 9, p. 307-319.

لئے فلسفہ اشراق پر مفصل معلومات کے لئے دیکھو

لئے واحد سرمایہ تشکیل ہے۔

فلسفہ اشراق خدا کو اتنا ہی نہیں، بلکہ وہ اس کو تمام کائنات میں جاری و ساری اتنا ہی اس کے نزدیک خدا فیج خیر ہے۔ اور مادہ مخزن شر و ظلمات، اس کے اذعان و یقین میں خدا حقیقت واحد ہے اور انسانی روح اُس کا پرتو، اس عقیدہ کے ساتھ ساتھ فلسفہ اشراق روحانیت، اخلاق، تزکیہ باطن، اور تصنیف نفس کی طرف بھی دعوت دیتا ہے اور انسان کو لہذا اُنہ جہانی ترک کر کے تقویٰ و طہارت کی زندگی بسر کرنے پر ابھارتا ہے۔ یہ سب کچھ سہی لیکن اصل یہ ہے کہ چونکہ اس فلسفہ کی بنیاد کسی خدائی قانون (روحی الہی) پر نہیں تھی، اور یہ محض عقل کی لامٹی کے سہائے کھڑا ہوا تھا۔ اس بنا پر خود خدا کی صفات و ذات کی نسبت اس فلسفہ نے ایسی متشککات کیاں کیں کہ انہوں نے انسان کی روح کو دلاسا دینے کے بجائے اسے ایک اور ہولناک و رطہ حیرت نازیب میں پھنسا دیا مثلاً اس فلسفہ نے بتایا کہ۔

(۱) خدا غلہ اعلیٰ ہے۔ اور چونکہ غلہ تامہ سے معلول کا صدور بلا اختیار و الارادہ نہیں ہوتا بلکہ بلا اضطرار ہوتا ہے اس لئے عالم کی تخلیق بھی خدا سے اضطرار آہوئی ہے، اس میں اُس کی مشیت اور ارادہ کو کوئی دخل نہیں، اس کی مثال بالکل آگ کی سی ہے کہ جب وہ پائی جائیگی تو حرارت پیدا ہوگی ہی، خواہ آگ کے لئے ارادہ ہو یا نہ ہو۔

(۲) خدا کی ذات اس قدر ارفع و اعلیٰ ہے کہ ہم اُس کی طرف کسی صفت مثلاً علم، ارادہ، اور خیر کا بھی انساب نہیں کر سکتے، حد یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ وجود رکھتا ہے۔ کیونکہ ہر موجود کا تصور ممکن ہے اور خدا کا تصور ہو ہی نہیں سکتا (لَا یُحَدُّ وَلَا یَتَّصَرُّ)

(۳) انسان کی روح اگر حتی لذتوں میں مبتلا رہے گی تو وہ قالب بدلتی رہے گی خواہ وہ کسی انسان کا ہو یا حیوان کا یا نباتات کا۔

غرض یہ ہے کہ اس فلسفہ نے کہیں و پرورد لا اور میت کی یقین کی اور کہیں دیدانت فلسفہ کے



دیکھا دیکھی تنازع کا اقرار کیا۔ یہ لوگ چلے تھے حق کی تلاش میں، لیکن جب عقلِ محض کی قیادت راہِ طلب کی جھلک  
 صورتوں کی حریت نہ بن سکی، تو انجام کار حضرت موسیٰ کی قوم کی طرح خود اپنے وجود کو بھی دادی حیرت میں گم  
 کر کے بیٹھ رہے۔ در نہ کیا وجہ ہے کہ یہ فلسفہ روحانیت اور اخلاق کے چند و چند مواعظِ حسنہ کے باوجود تمام  
 دنیا کا تو کیا ذکر ہے، کسی ایک انسانی سوسائٹی میں بھی عظیم الشان روحانی و اخلاقی انقلاب پیدا نہیں کر سکا، بلکہ  
 حق تو یہ ہے کہ اس فلسفہ نے انسان کو داعیِ بند پر دازیوں میں مشغول کر کے اسے عملی جدوجہد سے محروم کر دیا۔ اور  
 اس کی عملی قوتوں کو اس درجہ مضمحل بنا دیا کہ وہ تقریباً از کار رفتہ ہو کر رہ گئیں۔ مرزا غالب نے شاید اسی قسم  
 کے لوگوں کی نسبت کہا ہے۔

ہاں اہل طلب کون سے طعنہ نایافت دیکھا کہ وہ تمنا نہیں اپنے ہی کو کھو آئے

موجبات ممکن و یقین عقلِ منطوق اور فلسفہ ان سب دروازوں سے ایسے لٹنے کے بعد پھر وہی سوال پیدا  
 ہوتا ہے کہ اچھا بتاؤ اطمینان و سکون کا وہ خزانہ کہاں ہے جو انسانیت کی روحانی طلب کو سکون عطا کر کے  
 قبل اس کے کہ آپ اس کا جواب معلوم کریں، یہ جان لینا ضروری ہے کہ یقین کی ماہیت کیا ہے؟ اور یہ  
 کس طرح پیدا ہوتا ہے؟

کم و بیش تمام علماءِ نفسیات نے یقین کی ماہیت اور اسکے اسبابِ طلل پر بحث کی ہے لیکن نفس یقین کی  
 کوئی جامع و مانع تعریف نہیں ہو بلکہ اسکی مختلف قسمیں ہیں مثلاً منطقی یقین (Logical Certainty)  
 نفسیاتی یقین (Psychological Certainty) اور مذہبی یقین (Religious Certainty)  
 اور یقین کا تحقق انہیں اقسام میں سے کسی ایک قسم کے ضمن میں ہوتا ہے، ان اقسام کی تعریفیں جدا جدا ہیں لیکن  
 ان سب میں ماہر الاشتراک یہ ہے کہ یقین ایک طرح کا نفسی میلان ہے جو خاص خاص موثراتِ خارجی و ذہنی  
 کے زیر اثر انسان کے قلب میں پیدا ہو جاتا ہے۔ اس نفسی میلان کو پیدا کرنے کے لئے نہ فلسفیانہ اور منطقی

لے تفصیلی معلومات کے لئے دیکھو Encyclopaedia of Religion & Ethics v. 11/pt. 320-330

دلائل کی ضرورت ہے۔ اور نہ ریاضی و اقلیدس کی بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ میلان نہ علم پر موقوف ہے اور نہ جبل پر، اُس کا انحصار نہ سچ پر ہے اور نہ جھوٹ پر، فرض کیجئے ایک ڈاکٹر ہے جسے آپ جانتے ہیں کہ اُس نے اب تک جتنے علاج بھی کئے ہیں اُن میں وہ ناکام رہا ہے۔ اس بنا پر اگر آپ کا کوئی عزیز بیمار ہو جائے تو چونکہ آپ کو اس ڈاکٹر کی نالائقی کا یقین ہے، اس لئے اگر کوئی شخص آپ کو اس ڈاکٹر کے علاج کا مشورہ دیکھا بھی تو آپ فوراً انکار کر دینگے لیکن آپ کے برخلاف ایک اور شخص ہے جو کم از کم ڈاکٹر موصوف کے میں کامیاب علاجوں کا مشاہدہ خود اپنی آنکھ سے کر چکا ہے۔ اس لئے اگر آپ اپنے مرضِ مزید کے علاج سے متعلق اس شخص سے مشورہ کریں گے تو وہ بے تامل و تردد کہے گا کہ اسی ڈاکٹر سے رجوع کیجئے کیونکہ اُسے اپنے ذاتی تجربہ و مشاہدہ کے باعث ڈاکٹر کی قابلیت و مہارت فن کا ایسا ہی یقین ہے جیسا کہ آپ کو ڈاکٹر کی عدم قابلیت کا، اس مثال سے واضح ہوا ہو گا کہ یہاں ڈاکٹر کی قابلیت کی نسبت شخصِ مذکورہ صدر کا نفسی میلان (یقین) اُس کے تجربہ پر مبنی ہے۔

اب اس کے بعد اس پر غور کیجئے کہ تجربہ کبھی مسلسل مشاہدہ سے پیدا ہوتا ہے اور کبھی عملِ ذوق و وجدان سے۔ آپ نے اُردو شاعری میں زہد آبادہ خوار اور زہد تقویٰ شاعر کی نوک جھونک دیکھی ہوگی۔ دیکھئے زہد شراب کی بُرائی کا یقین۔ لکھا ہے۔ لیکن اس کے برعکس زہد آبادہ آشام کو شراب کی جانفروزی کا اس درجہ یقین ہے کہ وہ دعویٰ سے کہتا ہے:-

جاں فزاہر بادہ جس کے ہاتھ میں جام آگیا سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگِ جاں ہو گئیں  
پھر زہد اُس کے اس یقین کو توڑنے کے لئے دلائل و براہین پیش کرتا ہے تو وہ ان کے جواب میں صرف اتنا کہتا ہے:-

ذوقِ این باہِ ندانی بخدا تا پختی

غرض یہ ہے کہ یقین جس کی حقیقت ایک نفسی میلان کے سوا اور کچھ نہیں ہے مختلف جذباتِ قلبی کیفیت

کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اس بنا پر کوئی ایک شخص کسی دوسرے کو اس لئے مطعون نہیں کر سکتا کہ وہ کسی چیز کی نسبت اس کی طرح یقین و اذعان کیوں نہیں رکھتا یا اس ضمن اور ملامت اگر ہو سکتی ہے تو وہ محض اس بات پر ہو سکتی ہے کہ اس دوسرے شخص کے دل میں وہ کیفیت کیوں پیدا نہیں ہوتی جس کی وجہ سے دل میں اس چیز کی نسبت نفسی میلان پیدا ہوتا، چنانچہ قرآن مجید نے ان کفار کے متعلق جو کلمہ حق قبول نہیں کرتے تھے۔ یہ نہیں کہا کہ انھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کا یقین کیوں نہیں آتا بلکہ

خَتَمَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ وَعَلَىٰ سَمْعِهِمْ ۚ اللَّهُ نَسِيَ أَن كَانُوا يُرْمَوْنَ

وَعَلَىٰ أَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۚ (بقرہ) ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔

زیرا اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ ان لوگوں میں فطرتاً ہی صلاحیت و استعداد ہی نہیں کہ ان کے دل میں آنحضرت اور قرآن کی حقانیت و صداقت کے متعلق نفسی میلان پیدا ہو۔

اس تقریر سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ یقین بذات خود کوئی مستقل چیز نہیں بلکہ وہ ثمرہ ہوتا ہے ایک خاص طرح کے طبعی قلبی جذبات و اثرات کا، اب اس مقدمہ کو ذہن نشین کر کے آپ غور کر نیلے تو بین طور پر محسوس ہو گا کہ وحی الہی انسان کے دل میں جس طرح اطمینان و سکون پیدا کر دیتی ہے وہ بالکل ایک نفسیاتی طریقہ ہے اور اس لئے انسان اس پیغام ربانی کو نہ کر اس شک و تردید سے دوچار نہیں ہوتا جس کا سبب بالعموم منطقی طرز بحث و استدلال ہوتا ہے۔

مثلاً اگر اس کو یہ بتانا ہے کہ قرآن مجید خدا کا کلام ہے تو وہ اس سے بحث نہیں کرتا کہ خدا کلام کرتا ہے یا نہیں؟ اور اگر کرتا ہے تو کس طرح؟ کیا اس کے لئے نطق پایا جاسکتا ہے؟ کیا نطق کے لئے عضلات و اعصاب کی ضرورت نہیں ہے؟ جبریل رسول اللہ کے قلب پر کلام خداوندی کا اقرار کرتے ہیں تو کس طرح؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ وہ جانتا تھا کہ یہ مابعد الطبیعیاتی حقائق ہیں جن کی گہرہ کشائی آج تک نہ کسی عقل

کے ناخن تدبیر نے کی ہے اور نہ کر سکے، جب مشاہدات اور محوسات کی دنیا میں ہی قدم قدم پر ٹھوکر س کھانی پڑتی ہیں تو پھر عالم مجردات و معقولات کی دستیں کس طرح انسان کی محدود عقل میں سمٹ سکتا کر جمع ہو سکتی ہیں گوارا سکتے قرآن نے اس طریقہ بحث و استدلال کو چھوڑ کر ایک بالکل نفسیاتی اور بہت زیادہ موثر طریقہ اختیار کیا اور وہ یہ کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور دعوت دی کہ تم آپ کے ایک ایک عمل اور ایک ایک حرکت و سکون کو نہایت گہری تنقید مگر انصاف اور عدل کی نگاہ سے دیکھو۔ اسے جانچو، پرکھو اور بتاؤ کہ کیا تم نے کبھی اُس ذات گرامی کو جھوٹ بولتے دیکھا ہے؟ کیا تمہیں کبھی ان کی کوئی حرکت مشتبہ نظر آئی ہے؟ کیا ان کے کسی فعل و قول پر بھی تمہیں کبھی حریف گیری کا موقع ملا ہے؟ اگر ان سے باتوں کا جواب نفی میں ہے اور یقیناً نفی میں ہے تو یقین کر دو کہ جس ذات نے عمر کا بہترین حصہ (۴۰ سال)، اس تقویٰ و ظہارت، معصومیت، اور فضائل اخلاق کے ساتھ بسر کئے ہیں وہ آج بھی جھوٹ نہیں بول سکتا اور آج بھی اُس کی زبان حق ترجمان کسی نا ملام اور نادرت بات سے آشنا نہیں ہو سکتی۔

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کہہ صفا پر چڑھ کر پہلی مرتبہ قریش کو دعوت اسلام دی تو یہی طریقہ اختیار کیا کہ ان سے پوچھا، بتاؤ! تم مجھ کو کیا سمجھتے ہو؟ جب سب نے بیک آواز اقرار کر لیا کہ "آپ نے اپنی صادق ہیں" آپ نے آج تک کوئی بات جھوٹ نہیں کہی، تو پھر آپ نے ان تک اسلام کا پیغام جان لیتا ہوں پوچھنا یا اور خود تسراں بھی سید کہن کی زبان اقدس سے یوں گویا ہوتا ہے۔

قَدْ كَبُتُّ فِلكمِ عَمَّا مِنْ قَبْلِهِمْ أَفَلَا تَعْقِلُونَ  
 میں نے تو تمہارے درمیان مدت تک عمر گزاری ہے کیا تم پھر بھی نہیں سمجھتے۔

دوسرے لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ وحی الہی پیمبر کو ایک فاضل و کامل مسلم یا ایک شفیق و عقل مند باپ کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور انسان کے کائنات یا اُس کے ضمیر و وجدان Inner Feeling سے اپیل کرتی ہے کہ جس طرح شاگرد و وجدانی طور سے اُستاد پر اور بیباپ پر اعتماد و کئی رکھتا ہے اور اسلئے

اتحاد کی تعلیمات اور باپ کی نصیحتوں کو شک و شبہ کی نظر سے نہیں دیکھا۔ اسی طرح تمام دنیا کو پیغمبر کی ذات پر اعتماد رکھنا چاہئے اور اس کی تعلیمات و ہدایات کو گوشِ حقیقت نبوت سے منکر حوزہ دل و جان بنا لینا چاہئے۔

پس یہ ثابت ہو گیا کہ اصل صداقت و حقانیت اور کامل اطمینان و سکون کا سراغ صرف وحی الہی کے ذریعہ ہی مل سکتا ہے اور انسان کی روحانی تشنگی صرف اسی سرچشمہ ہدایت کے آبلال سے بجھ سکتی ہے۔ اللہ بس باقی ہوس۔ مذہبی دیوانوں کا کیا ذکر ہے، خود ان لوگوں نے جو کہ فلسفہ کی سب اونیچی سطح پر نظر آتے ہیں اس حقیقت کا کھلے نغظوں میں اعتراف کیا ہے۔

”ہم کو حصولِ صداقت سے مایوس ہو جانا چاہئے، بجز اس صورت کے کہ ہم یہ مان لیں کہ اس کا علم براہِ راست خود اسی ذات کی طرف سے عطا ہوتا ہے جو اس کا ابدی سرچشمہ ہے، یعنی خود خدا کی طرف سے، اور یہی وہ آخری حل تھا جو نو فلاطینیوں نے اختیار کیا اور جسکو ارتیابیت نے ناگزیر کر دیا تھا۔ علمی تفکر کی راہ سے حصولِ یقین کی مایوسی ہی اس پر مجبور کر سکتی تھی کہ صداقت کو وحی کے اندر پانے کی کوشش کی جائے جو فکر سے بالاتر ہے۔“

ایک اور فلسفی کہتا ہے۔

”انسان کے پاس کوئی یقینی علم نہیں، ہاں خدا کے پاس ہے۔ اور مدعی جاہل انسان خدا سے

اسی طرح سیکھتا ہے جس طرح بچہ بڑوں سے“

اس جملہ میں جس طرح بچہ بڑوں سے، کی تشبیہ نہایت بیخ ہے۔ قائل کی مراد یہ ہے کہ جس طرح بچہ بڑوں سے کوئی بات سیکھتا ہے اور بڑوں کی عظمت و جلالت اور ان پر کامل اعتماد کی اذعان کی کیفیت کے قلب پرستولی ہونے کی وجہ سے بچہ کے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خطرہ نہیں گذرتا کہ بڑوں کا سکھایا ہوا سبق غلط ہو گا

۱۵ یوس کی سوانحی تاریخ فلسفہ ص ۸۲

۱۵ جانٹ کی تاریخ مسائل فلسفہ ص ۱۱۴

اسی طرح انسان جب کسی بات کو اس اذعان کے ساتھ قبول کرتا ہے کہ یہ منجانب اللہ ہے تو اُسے اس وقت کسی تردد و تذبذب سے دوچار ہونا نہیں پڑتا۔ اور وہ اپنے قلب میں اطمینان و سکون کی ایک جاں فرور کیفیت محسوس کرتا ہے۔

ڈیوڈ ہیوم کو سب جانتے ہیں کہ ارتیبائی تھا اور وحی و الہام کا بھی منکر تھا لیکن پھر بھی ایک موقع پر ساز فطرت کے نعمت کی ایک ہلکی سی آواز اُس کے زبانِ قلم سے ظاہر ہو ہی گئی۔ وہ لکھتا ہے:-  
 ”جاں تک تجربہ اس طرح کے مسائل کی تائید کرتا ہے۔ وہاں تک تو یہ استدلال پر مبنی ہوتے ہیں لیکن ان کی اصلی اور محکم بنیاد وحی و ایمان پر ہے۔“

مولانا عبد الباقی ندوی نے فہم انسانی کے دیباچہ میں اسی حقیقت کو نہایت دلچسپ اور طبع پیرایہ میں ظاہر کیا ہے۔ لکھتے ہیں:-

ظواہر عالم کی نسبت ہم بہت کچھ جانتے اور جان سکتے ہیں۔ لیکن حقائق عالم کی نسبت کچھ جاننے کا دعویٰ کریں تو نرا جہل مرکب ہو گا اور بقول سقراط ہم اتنا بھی نہیں جانتے کہ نہیں جانتے۔ اس زندگی کو ہم چاہے جتنا سنواریں اور بنائیں لیکن اس کے آگے اور پیچھے کی اگر کچھ فکر ہو تو۔ اول و آخر میں کہنے کتاب افتاد دست، ”نہ پیچھے کا کچھ نشان ملانہ آگے کی کچھ خبر دے سکتے ہیں سوائے اس کے کہ بس بیج کے اوراق اُلٹ پلٹ کر لال بچکر دون کی طرح ہرن کے پاؤں میں چکی کا پاٹ باندھتے رہے، غرض اپنے یا کائنات کے آغاز و انجام، حقیقت و ماہیت، غرض و خفایت کے بارہ میں یہ یا اس طرح کے جتنے سوالات یا ان کی تفصیلات ہوں، خالص عقل و استدلال نے ان کے بارہ میں کبھی اذعان و اطمینان نہیں بخشا، بلکہ فلسفہ سے انانیت کی یہ پائیاں اپنے حلق میں صرف کانٹوں کا اضافہ کرتی رہی اور جاں انسانی عقل و فہم نے تجربہ کی راہ سے ذرا بہک کر

لے فہم انسانی ص ۳۳

اس خازن میں اپنے دامن کو ابھایا تو خود فلسفہ کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ طعنانہ ہمت نے  
 دوہی چار قدم ڈالے تھے کہ شک اور ریب، جہل اور لاعلمی کے کانٹوں نے ہر طرف سو دامن  
 پکڑنا شروع کیا، ایک نکلا نہیں بوس نے پکڑا، اجال کے اندر جتنا پھڑکے، وہ اتنا ہی کھال کے  
 اندر گھٹتا جاتا ہے۔

انسانیت کی بیشتر آبادی ہمیشہ اس وادی میں وحی و ایمان کی رہنمائی کو قبول کر کے چلتی رہی،  
 عقل کو اگر دخل دیا بھی تو زیادہ تر قبول ہی کے لئے۔ البتہ مغرب جہاں سے آفتاب نکلتا نہیں  
 بلکہ جہاں ڈوبتا ہے وہاں کی نئی پرانی دنیا دونوں کو وحی و ایمان سے کچھ قدرہ پھڑکا رہا ہو  
 تو اس کے فلسفہ کی نئی پرانی دونوں تاریخوں کی جو کم و بیش ڈانی ہزار سال کی وسعت میں  
 پھیلی ہیں۔ درق گردانی کر جاؤ، جتنا آگے بڑھتے جاؤ گے اتنا ہی دانش کی جگہ نادانی اور  
 علم کی جگہ لاعلمی سے دوچار ہوتے جاؤ گے۔ (دیباچہ فہم انسانی)

اس حقیقت کو ایک اور مثال سے سمجھئے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہمارے تمام مشاہدات کا تعلق بنیائی سے ہے  
 لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ مشاہدہ کا انحصار صرف قوت بصارت کے صحیح و سالم ہونے پر ہے؟ ہرگز نہیں! بصارت  
 کے ساتھ ساتھ خارجی روشنی کی بھی ایسی ہی ضرورت ہے جیسی کہ بنیائی کی۔ کوئی شخص خواہ کتنا ہی تیز نظر ہو  
 لیکن اگر کوئی خارجی روشنی نہ ہو، آفتاب کی ہو، یا کسی لمپ یا بجلی کی اور تمام فضا تاریک ہو، تو ظاہر ہے کہ یہ  
 تیز نظری کسی کام کی ثابت نہیں ہوگی۔ پس اسی طرح عقل میں قدرت کی طرف سے جو قوت بصیرت و دلالت رکھی  
 گئی ہے وہ اپنی جگہ مسلم اور درست، لیکن جس طرح بصارت بغیر خارجی روشنی کے محض بے کار ہے۔ اسی طرح  
 عقل کی روشنی صرف اسی وقت کارآمد ہو سکتی ہے جبکہ خارج میں بھی اس کی رہنمائی کے لئے کوئی قوی  
 روشنی موجود ہو۔ اور یہ روشنی وہی ہے جس کو مذہب کی اصطلاح میں "وحی" کہتے ہیں۔ آیت ذیل میں  
 اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

هُوَ الَّذِي يُعَلِّيٰ عَلَيْكُمْ وَمَلَائِكَتُهُ  
 يَخْرُجُكُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ  
 وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ حَيًّا (الاحزاب)   
 وہ (خدا) وہی ہے جو خود اور اس کے فرشتے تم پر  
 رحمت بھیجتے ہیں تاکہ وہ تم کو تاریکیوں سے نکال کر نور کی  
 طرف لے آئے اور اللہ مومنوں پر بڑا رحم کرے والا ہے

بصارت اور بصیرت میں صرف ظاہر و باطن کا فرق ہے، ورنہ دونوں کا حال افادہ کے اعتبار سے بالکل  
 یکساں ہے۔ جس طرح آفتاب سماوی کے بغیر بصارت ناکارہ ہے ٹھیک اسی طرح عقل و خرد کی بصیرت خورشید  
 حقیقت کی جلوہ پاشیوں کے بغیر اپنی ذاتی صلاحیتوں کے باوجود قطعاً بے فائدہ ہے۔ اور اگر کوئی شخص  
 اس روشنی کے بغیر ہی محض عقل کے سہارے چلنا چاہتا ہے تو وہ اُس بیوقوف سے کسی طرح کم درجہ کا احمق نہیں  
 ہے جو نہایت شدید تاریکی میں بھی اپنی آنکھوں پر اعتماد کر کے سر پٹ دوڑنا چاہتا ہے۔  
 ترجمان حقیقت ڈاکٹر اقبال مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

انجام خرد ہے بے حضوری      ہے فلسفہ زندگی سے دوری  
 افکار کے نعمائے بے صوت      ہیں ذوقِ عمل کے واسطے موت  
 دل در سخن محمدی بسند      اسے پور علی زبور علی چند

لے مشہور مسلمان فلسفی شیخ ابو علی بن سینا۔

18363

PANJAB  
 UNIVERSITY  
 LAHORE



# وحی کے لغوی اصطلاحی معنی

وحی کے معنی لغت میں حسب ذیل ہیں  
 (الوحی الاشارة والكتابة والرسالة) وحی کے معنی اشارہ کرنا، لکھنا پیغام دینا دلیں ڈالنا،  
 والكلام الخفی وكل بالقیمة الی غیرک) چھپا کر بلنا اور جو کچھ تم کسی دوسری کے خیال میں ڈالو

اشارہ کرنا۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

ترسی عینہا غیبی ففقرت و جیہا  
 و تعرفت عینی ما بہ الوحی یروج

قرآن مجید میں ہے۔

ح (فادحی الیہم ان یتحو ا بکرۃ و عشیا) تو اشارہ سے کہا ان کو کہ یاد کرو صبح اور شام

لکھنا۔ عجاج کا شعر ہے۔

حتی نجاہم جدنا وانا لناعی  
 لقد رکان وحاؤ الواحی

خط اور کتاب، "لبید کا شعر ہے جو بیہ معلقہ کے چوتھے معلقہ میں ہے۔

فمدافع الریان عری رسمہا  
 خلقا کما ضمن الوحی سلامہا

"رکم دینا" عجاج کہتا ہے

وحی لہا القرار فاستقرت  
 وشد بالاراسیات اللبت

"چھپا کر بات کرنا" ابو ذؤیب کہتا ہے۔

فقال لہا وقد اوحت الیہ  
 الا لیسہ اناک ما یعف

آواز، ابوزبید کا مصرعہ ہے۔

### مرتبز ابجرف بو حی اعجم

لیکن اہل لغت کہتے ہیں کہ اس لفظ کے اصلی معنی دوسروں سے چھپا کر کسی سے چھپے چکے بات کرنے کے ہیں  
 کہانی عرب کا محاورہ بتاتا ہے، "و حیرت الیہ بالکلام و اوجیہ الیہ ہو ان حکم بکلام تخفیہ من غیرہ" یعنی  
 کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ، ابو اسحاق نووی کتاب ہے، "و اصل الوحی فی اللغۃ  
 کلہا اعلام فی خفاء" وحی کا اصل مفہوم تمام لغت میں چھپا کر اطلاع دینا ہے۔

قرآن مجید میں بھی یہ لفظ متعدد معنوں میں آیا ہے۔

شیطان کا دوسرے پیدا کرنا

۶ (یوحی بعضهم الی بعض و ان الشیاطین ان کے بعض بعض کو وحی کرتے ہیں اور بے شیطان

لیوحون الی اولیاءہم [الزمر: ۱۲۱] اپنے دوستوں کے دلوں میں دوسرے پیدا کرتے ہیں  
 دل میں کسی بات کا ڈال دینا۔

و اوحینا الی امم موسیٰ ان ارضینا اور ہم نے موسیٰ کی ماں کے دل میں یہ بات ڈالی  
 (۲۸۸ [القصص: ۷]) کہ تم ان کو دودھ پلاؤ۔

اس آیت میں بھی وحی دل میں بات ڈالنے کے معنی میں ہے۔

واذا وحیت الی الحواریین ان امنوا اور جبکہ میں (حضرت عیسیٰ کے) حواریوں کے دل میں

بی وید رسولی (۵ [المائدہ: ۱۱۶]) یہ بات ڈالی کہ تم مجھ پر درمیری رسول پر ایمان لے آؤ

نظری حکم جس کو وحی زوعی بھی کہتے ہیں۔

واوحی ربک الی النخل ان اتخذی اور تمہارے رب نے شہد کی کھئی کو وحی کی کہ تو

من الجبال بیوتنا (۱۵۱ [النحل: ۶۸]) پہاڑوں میں گھر بنائے۔

کام پر مقرر کرنا۔

(الم [فصلت] ۱۲۰)

وَادْحَىٰ فِي كُلِّ سَمَاءٍ أَمْرًا مَّهْلًا ۚ ادر خدا نے ہر آسمان کو اُس کے کام پر مقرر کر دیا۔

پھر یہ فطری حکم ذی روح کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ بے جان چیزوں کے لئے بھی وحی کا لفظ فرمایا گیا ہے مثلاً اس آیت میں۔

يَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ أَخْبَارَهَا بَانَ رَبِّكَ ۚ اُس دن زمین اپنا سب احوال بتائیگی کیونکہ آپ کے

اُدْحَىٰ لَهَا۔ (۹۹ [الزلزلة] ۵) رب نے اُس کو ان باتوں کی ہدایت دیدی ہے

پہلے بات کرنا۔

(۶ [الانعام] ۱۱۲)

يُوحِي بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ زخِوْفَ الْقَوْلِ ۖ یہ ایک دوسرے کو چکینی چٹپری باتیں وحی کرتے ہیں

وحی کے یہ معانی لغت کے اعتبار سے تھے۔ لیکن شریعت اسلام کی اصطلاح میں وحی خاص اس

ذریعہ غیبی کا نام ہے جس کے ذریعہ غور و فکر، کسب و نظر، اور تجربہ و استدلال کے بغیر خاص اللہ تعالیٰ کی طرف

سے، اُس کے فضل و لطف خاص سے کسی نبی کو کوئی علم حاصل ہوتا ہے لہذا وحی کا استعمال اس معنی خاص

میں اس کثرت سے ہوا ہے کہ وہ اس معنی میں منقولِ شرعی بن گیا ہے اور اس لئے جب کسی نبی کے ذکر

میں وحی کا لفظ بولا جائے گا تو اُس سے اجمالی ہی معنی مراد ہوں گے۔ چنانچہ قرآن مجید کی آیات اس کی شاہد

ہیں، اور جس کا ثبوت آئندہ باب سے مل جائے گا۔

اس کی مثال لفظ صلوٰۃ و زکوٰۃ اور حج کی سی ہے کہ اگرچہ ان کے لغوی معنی اُن معانی اصطلاح سے

مختلف ہیں جن کے لئے اسلامی شریعت میں یہ مخصوص ہو چکے ہیں لیکن اصطلاحی معانی میں اُن کا استعمال اس

کثرت سے ہوتا ہے کہ اب ان کے علاوہ کسی معنی میں یہاں تک کہ لغوی معنی میں بھی ان کا استعمال صحیح نہیں ہے

البتہ ہاں اگر سیاق و سباق میں کوئی قرینہ ہو تو اُس وقت کوئی دوسرے معنی مراد لئے جاسکتے ہیں پس اسی

طرح جب وحی کا لفظ مطلقاً بولا جائے گا تو اُس سے مراد یہی اصطلاحی معنی خاص مراد ہوں گے۔ لیکن قرینہ کے

موجود ہونے کی صورت میں دوسرے معنی بھی مراد لئے جاسکتے ہیں جیسا کہ مذکورہ بالا آیات سے ظاہر ہوتا ہے  
 وحی اور الہام کا فرق (اس موقع پر وحی اور الہام کا فرق بھی معلوم کر لینا چاہئے۔ وحی کے معنی اور پر معلوم ہو چکے  
 الہام کے لغوی معنی ہیں القار الشی فی القلب دل میں کسی چیز کا ڈالنا۔ قرآن مجید میں ہے۔

فاظنہا فجورہا و تقواہا  
 اللہ نے نفس انسانی کو بری باتوں اور نیک باتوں

دونوں کا الہام کر دیا ہے۔

وحی اور الہام میں یہ امر تو مشترک ہے کہ دونوں کسی چیز کے معلوم کر لینے کا ذریعہ غیبی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ  
 الہام ایک ایسا وجدان ہے جو نفس کو حاصل ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ شئی مطلوب کا علم حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن  
 یہ نتیجہ نہیں چلتا کہ علم کا مبداء کیا ہے، گویا یہ وجدان بھوک، پیاس، غم اور خوشی کے وجدان کی طرح ہے  
 ۔ مخلات وحی کے کہ اس میں علم کا مبداء پورے طور پر معلوم ہوتا ہے پھر ان میں ایک ماہ الفرق یہ بھی ہے کہ  
 الہام نبی اور غیر نبی دونوں کو ہوتا ہے لیکن وحی انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے۔ کسی غیر نبی کو علم کا یہ  
 ذریعہ غیبی میسر نہیں ہو سکتا۔ (۳)

وحی کی حقیقت | وحی کی اصل حقیقت کیا ہے؟ اس کا صحیح علم تو بجز خدا کے اور کسے ہو سکتا ہے۔ البتہ فلاسفہ  
 نے اپنی بساط کے مطابق کچھ نتیجہ چلانے کی فکر کی ہے۔ لیکن اس کا حاصل اس سے زیادہ نہیں ہے کہ وحی کے  
 امکان و جوازیں جو بہ ظاہر عقلی استبعاد نظر آتا ہے اُسے دور کریں۔ اور یہ ثابت کر دیں کہ علم و اطلاع کے جس  
 ذریعہ غیبی کو وحی کہتے ہیں اُس کا تحقق انسان کے باطنی قوی اور ملکات کی دریافت و تحقیق کی روشنی میں ناممکن  
 نہیں ہے۔ فلاسفہ یونان کے نتیجے میں تمسکین اسلام نے بھی اسی روش کو اختیار کیا ہے۔ اور انہوں نے بھی فلسفہ  
 کی تحقیق اور اُس کی اصطلاحات کی روشنی میں وحی کی حقیقت کا کھوج گمانے کی سعی کی ہے تاکہ وہ ان اعتراضات  
 و اشکالات کا جواب دے سکیں جو وحی ایسی البتہ الطبعی چیزوں پر فلسفہ کی طرف سے کئے جاتے ہیں۔ اس  
 میں کوئی شبہ نہیں کہ ان ائمہ اسلام کی نیت نہایت مبارک اور پاک تھی، اور اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے

ان کو اجر جزیل بھی عطا ہوگا۔ لیکن اس راہ سے اصل حقیقت کا سراغ پانے میں کس حد تک کامیاب ہو سکے ہیں؟ اس کا جواب نہایت مشکل ہے۔ ہم ذیل میں محض اسی رفع استبعاد کے نقطہ نظر سے، اور نیز یہ دکھانے کے لئے کہ وحی کی حقیقت کی تشریح و بیان کے سلسلہ میں فلسفہ کہاں تک پرواز کر سکا ہے۔

امام غزالی اور دوسرے متکلمین کی آرا اس باب میں امام غزالی اور بعض فلاسفہ اسلام کا بیان نقل کرتے ہیں۔

مقاصد المراد میں ہے۔

وَاللَّوْحِيُّ وَاللَّهَامُّ فَالْتَفَسُّ النَّاطِقَةُ  
 إِذَا كَانَتْ قُوَّةً بِحَيْثُ لَمْ يَكُنْ  
 اِسْتِغَالًا بِالْبَدَنِ وَالْعَامِنِ الْاِتِّصَالِ  
 بِالْمَبَادِي الْقَدِيمَةِ وَكَانَتْ الْمُتَخِيلَةُ  
 قُوَّةً بِحَيْثُ تَقْوَى عَلَى اِسْتِحْلَاصِ  
 الْحَسِّ الْمَشْتَرِكِ عَنِ اِنْحِوِاسِ نَظَاهِرِهِ  
 اَتَّصَلَتْ حَالَةً اِلَيْفِطَّةً بِالْعَقُولِ  
 الْمَجْرِيَةِ وَالنَّفُوسِ السَّادِيَةِ وَحَصَلَ  
 لَهَا اِدْرَاكُ الْمَعْنِيَاتِ عَلَى وَجْهِ كَلِّي  
 ثُمَّ الْمُتَخِيلَةُ تَحَاكِيهَا بِصُورَةٍ جَزِيئَةٍ  
 مَنَابِتِهِ لَهَا وَنَزَلَ اِلَى اِنْحِوِاسِ الْمَشْتَرِكِ  
 تَقْصِيرِ مَشَاهِدَةٍ مَحْسُوسَةٍ وَقَدْ لَعْرَضَ  
 لِبَعْضِهِمْ اَنْ لَيْسَ كَلَامًا مَنْظُومًا اَوْ شَائِدًا  
 مَنْظُرًا بَعْثًا بِخَاطِبَةٍ بِكَلَامٍ مَنْظُومٍ فِيمَا  
 باقی وحی اور الہام تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ  
 نفس ناطقہ جب اس قدر قوی ہوتا ہے کہ بدن  
 کے ساتھ مشغول ہونے کے باوجود مبادی قدیمہ  
 سے متصل ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ قوت تخیلہ  
 اس قدر قوی ہوتی ہے کہ جس مشترک کو جو اس  
 ظاہری سے نجات دے سکتی ہے تو نفس ناطقہ  
 بیداری کی حالت میں بھی عقول مجردہ اور نفوس  
 سادیہ سے متصل ہو جاتا ہے اور اس کو غیب  
 کی باتوں کا ادراک کلی طور پر ہوتا ہی پھر قوت تخیلہ  
 اس کے مشابہ ایک جزئی صورت پیدا کر لیتی ہے  
 یہ صورت جس مشترک میں اتر کر مشاہد اور محسوس  
 ہو جاتی ہے اور بعضوں کو یہ پیش آتا ہے کہ وہ  
 مسلسل کلام سنتے ہیں یا کوئی اچھی صورت دیکھتے  
 ہیں جو ان سے مسلسل الفاظ کے ذریعہ سوا باتیں کرتی ہو

تَخَلُّقُ بِالْحَوَالِ وَالْأَحْوَالِ بِالْقُرْبِ  
یہ باتیں خود انہی کے متعلق ہوتی ہیں یا ان کے  
تعلقات کے متعلق۔

اس کے علاوہ معارج القدس میں نبوت کے زیر عنوان امام غزالی نے جو بسیط مضمون لکھا ہے اس میں ایک فصل  
نبوت کے خواص میں ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں:-

وَلَهَا خَوَاصٌّ ثَلَاثٌ أَحَدُهَا تَابِعَةٌ  
بِخَبْرَةِ تَمِيمٍ خَاصَّةٌ قُوَّةُ تَحْيَلٍ  
بِقُوَّةِ التَّحْيَلِ وَالْعَقْلِ الْعَلِيِّ  
اور عقل علی کا تابع ہے۔

اس کے بعد اس خاصہ کو بہت شرح و بسط سے بیان کیا ہے جس کا حاصل وہی ہے جو مقاصد المراد کی  
مذکورہ بالا عبارت سے مستفاد ہوتا ہے۔

ابن سینا کی رائے | اس مضمون کو شیخ ابو علی سینا کے حوالہ سے ابواب بقا نے مختصر اور جامع و مانع الفاظ میں  
اسی طرح ادا کیا ہے۔ چنانچہ تعریفات میں جہاں وحی کی تعریف لکھی ہے لکھا ہے۔

فَحْنُ نَرْمِي الْأَشْيَاءَ بِوَسْطِهِ الْحَسِّ  
وَالْبَنِي بِرْمِي الْأَشْيَاءَ بِوَسْطِهِ الْقَوِيِّ  
بِالْبَاطِنَةِ وَنَحْنُ نَرْمِي تَمِيمٌ نَعْلَمُ وَالْبَنِي  
يَعْلَمُ تَمِيمٌ بِرْمِي  
ہم حس کے واسطے سے اشیاء کو دیکھتے ہیں اور بنی  
اشیاء کو قوی باطنہ کے ذریعہ دیکھتا ہے  
اور ہم دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور بنی جانتا ہے  
پھر دیکھتا ہے۔

اس کے علاوہ شیخ ابو علی بن سینا نے اپنی متعدد کتابوں میں وحی، الہام اور معجزات و خوارق عادات  
پر کلام کیا ہے۔ اشارات کا ایک مستقل عنوان اسی بحث کے لئے وقف ہے۔ رسالہ الفعل والافعال میں لکھا ہے

«وحی اور کرامات تاثر النفسانی فی النفسانی میں داخل ہیں، کیونکہ وحی کی حقیقت یہ ہے کہ

(وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے کسی امر عقلی کا اتقار خفی ان نفوس بشریہ میں ہے جو اس اتقار کو قبول

کرنے کی استعداد رکھتے ہوں۔ اگر یہ اتقار جاگنے کی حالت میں ہو تو اسے وحی کہتے ہیں۔ اور

اگر نیند کی حالت میں ہو تو اس کا نام نفس فی الروع ہے۔

(مطبوعہ مجلس دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ص ۳)

اس کے بعد نفس فی الروع کی چند مثالیں احادیث سے نقل کی ہیں۔

ابن سینا کی یہ وحی کی تعریف ہنایت محل اور مغالطہ انگیز ہے۔ اپنا ایک اور رسالہ "الرسالة العرشية"

میں خدا کی صفات پر بحث کے ضمن میں صفت کلام پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔

✓ "خدا کی ساتویں صفت مستکلم ہونا ہے۔ ہم پہلے بیان کر آئے ہیں کہ وہ ذات واحد ہے اور

علل اربعہ سے منزہ ہے۔ اس بنا پر اُس کے مستکلم ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اس کے لئے

عبارتیں پائی جاتی ہیں، یا اُس کے لئے نفس کے خطرات اور فکر و تخیل کے ادراکات پائے

جاتے ہیں جن پر الفاظ دلالت کرتے ہیں بلکہ خدا کے مستکلم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اُس کی طرف

سے بواسطہ قلم تعاش جس کو عقل فعال یا مقرب فرشتہ کہتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے لوح قلب پر علوم کا فیضان ہوتا ہے۔ پس کلام خدا اُن علوم کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور علم میں تعدد و کثرت نہیں ہوتا جیسا کہ ارشاد

ہے۔

وما امرنا الا واحداً کلح بالبصر اور ہمارا کام تو بس ایک دم کی بات ہے جیسے

ایک نگاہ کی۔

تعدد اور کثرت تو حدیث نفس اور خیال وحس میں ہوتا ہے،

اصل میں صورت یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کے ذریعہ علم غیب کو حاصل کرتے

تھے۔ اور قوت تخیل اس کو قبول کر کے مختلف حروف و اسکاں کی صورت سے مصور کردہ تھی

تھی، اس کے بعد نفس کی لوح جو اب تک خالی ہوتی تھی اُس میں یہ عبارتیں اور صورتیں منقش

ہو جاتی تھیں، اب ان سب کا اثر یہ ہوتا تھا کہ آپ منظوم و مرتب کلام سنتے تھے اور ایک انسانی جسم کو دیکھتے تھے۔ پس اسی کا نام وحی ہے، الغرض آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فطر مبارک ایک صاف و شفاف صیقل شدہ آئینہ کی طرح تھا جس میں انوار کرنے والے اور وہ معانی و مطالب جن کا انوار جاتا تھا۔ دذلوں مصور ہو جاتے تھے۔ کبھی ان معانی منقشہ کا ظہور عبرانی زبان میں ہوا اور کبھی عربی میں، گویا یوں کہتے کہ مصدر ایک ہے اور مظاہر متعدد ہیں۔ اس پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نفس یا ذہن کے ذریعہ کسی طرح لاکھ کی ردیت کر لیتے تھے، کیونکہ حس کا حال یہ ہے کہ وہ کبھی عموماً اس ظاہری کے واسطے سے قبول کرتی ہے اور کبھی مشاعر باطنی کے واسطے سے۔ ہم میں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں فرق یہ ہے کہ ہم پہلے دیکھتے ہیں پھر جانتے ہیں اور آنحضرت پہلے جانتے تھے پھر دیکھتے تھے۔

(مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ص ۱۲)

حافظ ابن تیمیہ کی رائے | لیکن اس معاملہ میں حافظ ابن تیمیہ نے مجموعہ الفتاویٰ اور بعض اور تصنیفات میں زیادہ صاف بیانی سے کام لیا ہے۔ انھوں نے ابن سینا اور اس کے ہم خیال فلاسفہ کی تغلیط کی ہے اور ساتھ ہی امام غزالی پر نکتہ چینی کی ہے کہ وہ بھی فلسفہ سے مرعوب ہو کر وحی اور نبوت کے باب میں بعض ایسی باتیں بیان کر گئے ہیں جو قرآن و حدیث کی تصریحات کے خلاف ہیں اس سلسلہ میں امام ابن تیمیہ عقل فعال کے وجود سے انکار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اگر عقل فعال کا وجود صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نبوت وہی نہیں کسی ہے۔

(۷) (۸) بہر حال قرآن مجید سے وحی کے متعلق جو معلوم ہوتا ہے وہ صرف اسی قدر ہے کہ فرشتہ (جو فلاسفہ کے قول کے مطابق نفس انسانی کی صفات کا نام نہیں بلکہ وہ جو اہر مجردہ اور قائمہ بالذات ہیں) خدا کا پیغام لیکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا تھا اور آپ کے قلب مطہر پر اس پیغام الہی کا انوار کرتا تھا (۱)



## روحی کی مختلف صورتیں

احادیث سے معلوم ہوتا ہے آپ پر وحی مختلف طریقوں سے نازل ہوتی تھی۔ حافظ ابن قیم نے زاد المعاد جلد اول میں انہیں حدیثوں کے پیش نظر وحی کی حسب ذیل صورتیں بیان کی ہیں۔

- (۱) رویائے صادقہ  
بیخ خواب دیکھنا
- (۲) نفس فی الروح یا القارنی القلب  
دل میں پھونکنا یا دل میں ڈالنا
- (۳) صلصلة البحر  
گھنٹہ کی آواز کی طرح آنا
- (۴) تمثیل  
فرشتہ کا کسی شکل میں مشکل ہو کر نظر آنا
- (۵) فرشتہ کا اپنی اصلی صورت میں نظر آنا
- (۶) وہ طریقیہ مکالمہ جو معراج میں پیش آیا۔
- (۷) بلا واسطہ مکالمہ
- اب ہم ہر ایک کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔

رویائے صادقہ | رویائے صادقہ کے معنی ہیں تپا خواب، یعنی جو کچھ رات کو خواب میں دیکھا فوراً ہی یا کچھ دنوں کے بعد بعینہ اُس کے مطابق کوئی واقعہ ظاہر ہو گیا۔ اس خواب کو نبوت کا چھپا لیسواں جزو کہا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوسعید الخدیری سے روایت ہے الرویا الصالحۃ جزء من سنیہ و اربعین جزء من النبوة، لیکن یہ واضح رہنا چاہئے کہ رویا صادقہ کو نبوت کا جزو محض اس لئے فرمایا گیا ہے کہ جس طرح نبی کی خبر بالکل صحیح ہوتی ہے اور اُس میں کذب و دروغ کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا

اسی طرح یہ خواب بالکل سچا ہوتا ہے۔ جو رات کو خواب میں نظر آیا۔ دن کو وہی آنکھوں سے دیکھ لیا۔  
یہی وجہ ہے کہ رویا و صادقہ کو نبوت کا جزو قرار دیا گیا ہے رسالت کا نہیں کیونکہ نبوت کے  
معنی بعض غیبی امور سے واقف ہونا اور ان کی اطلاع دینا ہے اور چونکہ رویا و صادقہ میں بھی یہی ہوتا  
ہے اس لئے اس کو نبوت کا ایک جزو کہا جاسکتا ہے، لیکن رسالت کا مقام اس سے بلند ہے اس کے  
مفہوم میں احکام شرعیہ کی تبلیغ و اشاعت اور ادا و امر و نواہی سے لوگوں کو خبردار کرنا داخل ہے۔ ظاہر  
ہے رویا و صادقہ کا اس سے کیا تعلق ہو سکتا ہے۔

یہی رویائے صادقہ ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا۔ صحیح بخاری  
کے پہلے باب میں حضرت عائشہ سے روایت ہے

أَوَّلُ مَا بَدَأَ بِهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْيِ الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ  
فِي النَّوْمِ وَكَانَ لَا يَرَى رُؤْيَا إِلَّا جَاءَ مِثْلَ فَلَقِ الْصَّحِيحِ  
سب سے پہلی وہ چیز جس سے آنحضرت صلی اللہ  
علیہ وسلم پر وحی کا آغاز ہوا نیند میں رویا  
ہے حضور جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے  
کی طرح صحیح نکلتا تھا۔

لے یہ واضح رہنا چاہئے کہ انبیاء کرام کا خواب ہمارے خواب اور ان کی نیند ہماری نیند کی طرح نہیں ہوتی۔ اس عالم  
میں ان کی آنکھیں اگرچہ بند ہوتی ہیں لیکن دل بیدار ہوتا ہے بخاری میں ہے

تَنَامُ عَلَيْهِمْ وَلَا تَنَامُ قُلُوبُهُمْ ان کی آنکھیں سوتی ہیں دل نہیں سوتے ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی نسبت فرماتے ہیں تَنَامُ عَيْنِي وَلَا يَنَامُ قَلْبِي، اس کے علاوہ  
ایک بات یہ بھی یاد رکھنی چاہئے کہ عربی زبان میں ردیاصرف اس خواب کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت کے اخبار و اعلام  
یا اس کی جانب اشارہ دیا پر مبنی ہو، عام خواب جس میں شیطانی وساوس کو زیادہ دخل ہو اسے علم جمع احلام کہتے ہیں  
چنانچہ بخاری کتاب الروایا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے (بعینہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

رویاے صادق سے آغاز وحی کی حکمت | حافظ ابن حجر خواب سے وحی کے آغاز کی حکمت یہ بیان کرتے ہیں کہ عالم بیداری میں حضور پر نور پر جو وحی نازل ہونے والی تھی اس کے لئے بہ طور تمہید تو طیبہ پہلی وحی خواب کے ذریعہ نازل کی گئی تاکہ آپ اس طرح خوارقِ عادات ایسی چیزوں کے لئے یک گونہ عادی ہو جائیں۔

نفس فی الروح | دوسری صورت یہ ہے کہ فرشتہ آپ کے قلب پر بغیر نظر آئے کسی بات کا انکار کر دیتا تھا جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، روح القدس نے میرے قلب میں یہ بات ڈال دی کہ کوئی نفس اوس وقت تک نہیں مرے گا جب تک کہ وہ اپنے رزق کی تکمیل نہیں کرے گا۔ پس تم اللہ سے ڈرو اور طلب میں خوش روشی سے کام لو اور خبردار ہو کہ کہیں رزق کا متاخر ہو جانا تم کو اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ اللہ کی معصیت کی راہ سے اس رزق کو طلب کر دو۔ کیونکہ اللہ کے پاس جو کچھ ہے وہ اسکی طاعت و بندگی سے ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ)

الرویا من اللہ والحلم من الشیطان | رویا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے اور حلم شیطان کی طرف سے پھر ان خوابوں میں جو خواہائے پریشان ہوتے ہیں انھیں اضغاثِ احلام کہتے ہیں۔ سورہ یوسف کی آیت ذیل میں انہوں نے لفظ جمع ہو گئے ہیں۔

یا ایھا الملاءم افترنی فی رؤیای ان کنتم  
للرؤیا تعبرونہ قالوا اضغاثِ احلام  
وما نحن بتاویل الاحلام بعلین

لیکن حضرت الاساذ مولانا سید محمد انور شاہ لکھنوی کی تحقیق یہ ہے کہ رویا کے معنی خواب کے نہیں ہیں بلکہ وہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جو نہ پسے طور پر بیداری ہے اور نہ کامل نیند بلکہ ان دونوں کی ایک درمیانی حالت ہے۔ حضرت الاساذ فرماتے ہیں کہ میرا ذاتی خیال تھا لیکن مدت کے بعد علامہ فرید وجدی کی دائرۃ المعارف دیکھنے کا اتفاق ہوا تو معلوم ہوا کہ میں جو کچھ رویا کی حقیقت سمجھتا تھا وہی بعینہ محققین یورپ کا خیال ہے (فیض الباری مطبوعہ مصر ص ۱۲۲)

صلصلة البحر تیسری صورت یہ تھی کہ وحی صلیصلۃ البحر یعنی گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی تھی صحیح بخاری میں ہے  
 ”حارث بن ہشام نے ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کس طرح نازل  
 ہوتی ہے؟ آپ نے فرمایا ”کبھی کبھی وحی میرے پاس گھنٹہ کی آواز کی طرح آتی ہے اور یہ میرے اوپر سخت  
 ترین ہوتی ہے۔ جب یہ مجھ سے منقطع ہوتی تھی تو فرشتہ جو کچھ کہتا تھا وہ سب مجھ کو یاد ہو جاتا تھا (باب برد الوحی  
 وحی کی اس خاص نوعیت کو سمجھنے کے لئے یہ معلوم کر لینا ضروری ہے کہ صلیصلۃ اصل میں اس آواز کو کہتے ہیں  
 جو لوہے کے ایک ٹکڑے کو دوسرے ٹکڑے پر مارنے سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن پھر میں توسیح کر لیا گیا ہے  
 اور اس لفظ کا اطلاق ہر اس آواز پر ہونے لگا ہے جس میں جھنناہٹ (طنین) ہو۔ وحی کی آواز کو اس آواز  
 سے تشبیہ دی گئی ہے اور وجہ شہ یہ ہے کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز صورت محض کی صورت میں سنائی دیتی ہے اور  
 اس کا کوئی مبداء و منقطع نہیں ہوتا۔ اسی طرح وحی یا پیغام بر وحی کی اس آواز میں بھی کوئی مبداء یا منقطع نہیں  
 ہوتا تھا۔ اس بنا پر یہ آواز مرکب نہیں بلکہ بسیط ہوتی تھی۔ شیخ اکبر محی الدین بن عربی نے وجہ شہ یہ بیان کی ہے  
 کہ جس طرح گھنٹہ کی آواز کے لئے کوئی جہت خاص نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ تمام جانب و جہات سے سنائی دیتی ہے  
 اسی طرح وحی کی اس آواز کے لئے بھی کوئی جانب یا جہت نہیں ہوتی تھی۔ حضرت الاتاذ نے اس وجہ شہہ کو  
 نہایت لطیف کہا ہے ”لیکن خود ایک جگہ فرماتے ہیں۔“

وَصَلَّصَلَّةُ الْبَحْرِ يَهْنَأُ كَقِرَاتِ

الْبُلْبُلِ لَا دَاوِعَ الرِّسَالَةَ

اور زردل وحی کے وقت گھنٹہ کی سی آواز ٹیلیگرام کی  
 گھڑا گھڑا ہٹ کی طرح ہو جو پیغام رسائی کیلئے کی جاتی ہو  
 اس تشبیہ سے اس طرف اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ تار کی گھڑا گھڑا ہٹ میں آواز تو سنائی دیتی ہے لیکن  
 بولنے والا نظر نہیں آتا۔ اسی طرح وحی کی اس صورت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم محض آواز سنتے تھے  
 لیکن بولنے والا نظر نہ آتا تھا۔

اس حالت کی شدت | جیسا کہ صلصلہ البحرس والی حدیث میں مذکور ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ حالت  
 بہت شاق گذرتی تھی۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں: آپ پر وحی نازل ہوتی تھی اور دن نہایت سرد ہوتا تھا۔  
 پھر بھی (وحی کے بارے) آپ پر دباؤ اس قدر شدید ہوتا تھا کہ آپ کی پیشانی سے پسینہ پھوٹ نکلتا تھا، اور  
 اگر آپ کسی سواری پر ہوتے تھے تو سواری بوجھ کے مارے زمین پر بیٹھ بیٹھ جاتی تھی۔ ایک مرتبہ آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم پر اسی طرح وحی آئی حضرت زید بن ثابت اس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے  
 اور سید کوزین کافرق مبارک ان کی ران پر تھا۔ حضرت زید پر وحی کا اتنا شدید بار ہوا کہ ان کا جسم  
 دبا جاتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ پارہ پارہ ہو جائے گا۔

حضرت عبادہ بن صامت بیان ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی تھی تو  
 آپ کو اضطراب پیدا ہو جاتا اور چہرہ مبارک کا رنگ بدل جاتا۔ آپ اس وقت سر جھکا لیتے اور جو صحابہ آپ  
 کے پاس بیٹھے ہوتے تھے وہ بھی سر نیچا کر لیتے تھے وحی کے بعد آپ سر اٹھاتے تھے۔

صنوان بن علی بن امیہ بیان کرتے ہیں کہ یعلیٰ کو بڑی خواہش تھی کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 پر وحی نازل ہوتی ہوئی دیکھیں، خدا نے ان کی مراد پوری کی۔ ایک مرتبہ جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 حرانہ میں قیام فرماتے یعلیٰ کو یہ سعادت نصیب ہو گئی اس کی تفصیل یہ ہے کہ حرانہ کے دوران قیام  
 میں آنحضرت صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک شخص آیا جس نے خوشبو لگا رکھی تھی۔  
 اور سوال کیا: اے رسول اللہ! آپ اس شخص کی نسبت کیا فرماتے ہیں جس نے ایک خوشبو لگے ہوئے جسم میں  
 ہی احرام کی نیت کر لی، یہ سوال سن کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی دیر انتظار فرمایا، یہاں تک کہ  
 آپ پر یکایک وحی نازل ہوئی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ حضور کا چہرہ مبارک سرخ ہے اور سانس بھی  
 تیز ہو گیا ہے جیسے کوئی تھکا ہوا ہو، تھوڑی دیر کے بعد جب یہ کیفیت دور ہو گئی تو آپ نے سائل کو بلا کر

لے پہ واقعہ حانظ ابن حجر نے فتح الباری میں کیفیت نزل الوحی کے ماتحت ہی بیان کیا ہے۔

اُس کے سوال کا جواب دیا۔

ایک سوال اور اُس کا جواب | اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وحی وحی تو سب برابر ہے پھر اس کی وجہ کیا ہے کہ آپ پر وحی کی یہ قسم (صلصلہ البحرس) بقیہ طرق وحی کی بہ نسبت زیادہ گراں گذرتی تھی؟ اگر ایک ذرع وحی کا تحمل بہ آسانی ہو سکتا تھا تو اس نوع وحی کا تحمل کیوں دشوار تھا؟ اس کا جواب، جیسا کہ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ الباقیہ میں لکھا ہے یہ ہے کہ انسان میں دو قوتیں ہیں ایک قوت بشریت اور دوسری قوت ملکیت، پھر فرشتے سے جب ان نفوس قدسیہ پر نازل ہوتے ہیں جن میں نبوت کی استعداد ہوتی ہے تو ان کو ظلمت بشری سے نکل کر عالم نور میں آنے کی وجہ سے سخت کش مکش اور مزاحمت باطنی سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اس کش مکش کی وجہ سے ان کے تمام اعصاب متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھئے کہ انسان نیند کی حالت میں کوئی ہمیت انگیز خواب دیکھتا ہے تو اگرچہ اُس خواب کا تعلق جسم سے نہیں ہوتا لیکن نفس کے تعلق بالجسم کے باعث اس خواب کا اثر جہانی اعضاء و جوارح پر بھی ظاہر ہوتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے صللصلہ البحرس کی تشریح بھی اسی تاثر و انفعال کی روشنی میں کی ہے فرماتے ہیں۔

وَالصَّلْصَلَةُ بِحَقِّقَتِهَا أَنَّ الْجَوَّاسِ إِذَا  
صَادَهَا تَأْثِيرٌ قُوَّتِي تَشْوِشٌ فَتَشْوِشُ  
قُوَّةِ الْبَصَرِ أَيْرِي أَلَا نَا الْحَمْرُ وَالصُّفْرُ  
وَالْمُخَضَّرَةُ دَسْخُذًا لِكِ وَتَشْوِشُ قُوَّةِ  
الْسَّمْعِ أَيْرِي صَوَاتًا مَبْهَمَةً كَالطَّنِينِ  
وَالصَّلْصَلَةُ وَالْمَبْهَمَةُ فَادَامَ الْأَثْرُ

رہا صللصلہ تو اُس کی حقیقت یہ ہے کہ جو اس سے  
جب کوئی قوی تاثر متاثر ہوتا ہے تو وہ تشویش  
ہو جاتے ہیں چنانچہ قوتِ بصر کی تشویش یہ ہے کہ  
مختلف رنگ مثلاً سرخی، زردی اور سبزی نظر  
آئیں وغیرہ ذاک، اور قوتِ سمع کی تشویش یہ  
ہے کہ مبہم آوازیں سنائی دیں مثلاً طنین، صللصلہ

لے صحیح بخاری باب نزل القرآن بلسان تزلزل

حَصَلَ الْعِلْمُ

اور ہمہ ہمہ پھر جب اثر تمام ہو جائے علم حاصل ہو جاتا ہے

حجۃ اللہ البالغہ میں ہی ایک دوسرے مقام پر باب الایمان بصفات اللہ تعالیٰ کے تحت اسی مضمون کو اس طرح بیان فرماتے ہیں۔

وَرَبَّهَا يَحْصِلُ عِنْدَ تَوَجُّهِهَا إِلَى الْغَيْبِ

اور بسا اوقات نبی کے غیب کی طرف متوجہ ہونے

وَالْقَهَّارِ إِتْحَاسِ صَوْتِ صَلْصَلَةِ الْبَحْرِ

اور جو اس کے مغلوب ہونے کی صورت میں گھنٹہ

کما قد يكون عند عروض الغشي من

کے بجنے کی سی آواز آتی ہے جیسا کہ غشی کے عالم

روية الوان حمر وسود

میں سُرخ اور سیاہ رنگ نظر آتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب کی مراد یہ ہے کہ یہ وہ خاص وقت ہوتا تھا جبکہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم عالم مادیت سے دراز اور ارفع ہو کر ملأ الاعلیٰ سے بہت زیادہ قریب ہو جاتے تھے اور اس وقت اگرچہ آپ کے حواس ظاہری میں تشویش پیدا ہو جاتی تھی لیکن ساتھ ہی آپ کی تمام روحانی قوتیں باطنی احساس و شعور اور ملکوتی صفات و خصائص مکمل طور پر عالم لاہوت کے جلوہ زار میں پہنچ جاتے تھے اور وہاں آپ وہ سنتے تھے جسے دوسرے نہیں سن سکتے اور ان حقائق سے علی وجہ یقین آشنا ہوتے تھے جن کو نہ مادی حواس محسوس کر سکتے ہیں اور نہ جسمانی آلات ادراک و شعور انھیں دریافت کر سکتے ہیں اور چونکہ اس وقت آپ کی جہت بشری اور جہت ملکوتی میں تصادم ہوتا تھا اس لئے اُس کا اثر آپ کے اعضاء و اعضاء پر بھی پڑتا تھا اور اس اثر کے باعث آپ کو گھنٹہ کی سی آواز سنائی دیتی تھی، جبین اقدس عرق آلود ہو جاتی تھی۔ اور اس تاثر میں اس درجہ شدت ہوتی تھی کہ آپ کے پاس جو صاحبِ مٹھے ہوتے تھے انھیں بھی اس حالت کا بین طور پر احساس ہوتا تھا جب یہ کش مکش ختم ہو جاتی تو آپ کی یہ حالت یعنی اعصاب کا تاثر بھی زائل ہو جاتا تھا اور تمام وحی من وعن آپ کو یاد ہو جاتی تھی چنانچہ حدیث کے الفاظ۔

لہ حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۲۰۶ جدید ادیشن

فیفصم عنی وقد وعیت عنہ  
 دھی مجھ سے جب منقطع ہو جاتی تھی تو مجھ کو اس وقت  
 سب کچھ یاد ہو جاتا تھا۔

میں اس امر کا ہی اظہار فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کو صلصلۃ البحرس کے لفظ سے یہ شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ آپ  
 محض آواز سننے تھے اور دھی کا مضمون نہیں سمجھتے تھے۔ یاد دھی کا مضمون اُس وقت سمجھ لیتے تھے۔ لیکن  
 وہ آپ کو محفوظ نہیں رہتا تھا۔ غور کیجئے بصیغہ اضی و حیث فرانا اُس مضمون کو زیادہ مؤکد اور مؤثر طریقہ  
 پر بیان کرنے کے لئے ہی ہے۔

مزید تشریح | صلصلۃ البحرس کی مخصوص نوع دھی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو مقام پیش آتا تھا  
 اُس کا تعلق محض روح اور نفس سے ہے اس لئے اس کی تشریح اگر کوئی کر سکتا ہے تو صرف وہی  
 شخص کر سکتا ہے جو اپنی باطنی اور روحانی قوتوں کے باعث عقل اور نفس کے ملکات اور عالم تجرد کے  
 ساتھ ان دونوں کے تعلقات سے آگاہ ہو۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی سے بڑھ کر ان اسرار و رموز  
 کا محرم کون ہوگا! آپ حجۃ اللہ البالغہ کی جلد دوم بحث فی المقامات والاحوال میں فرماتے ہیں۔

ان القلب له وجهان وجه یسئل قلب کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ بدن اور اعضا کی  
 الی البدن والحوارج ووجه یسئل طرف اعلیٰ رہتا ہے اور دوسرا رخ تجرد اور صرافت  
 الی التجرد والصرافۃ وکذاک العقل کی طرف متوجہ رہتا ہے اسی طرح عقل کے بھی دو رخ  
 کہ وجہان ووجه یسئل الی البدن ہیں ایک رخ بدن اور جو اس کی طرف اعلیٰ ہوتا  
 والحواس ووجه یسئل الی التجرد ہے اور دوسرا رخ تجرد اور بساطت محض کی جانب  
 والصرافۃ فتموا یا علی الجانب السفلی پس جو رخ جانب سفلی سے متصل ہے اُسے قلب  
 قلباً و عقلاً و یا علی الجانب الفوق اور عقل کہتے ہیں اور جو جانب فوق سے ملتا ہے  
 روحاً و سراً فنصفہ القلب الشوق اُسے روح اور سیر کہتے ہیں اور قلب کی صفت فوق



المرزح والوحد وصفة الروح  
 الانس والابخواب وصفة العقل  
 اليقين باليقرب ماخذ من ماخذ  
 العلوم العاديه كالايان بالغيب  
 والتوحيد الاعمال وصفة الشهود  
 مايجل عن العلوم العاديه وانما هو  
 حكاية ما عن الجرد البصر الذي  
 ليس في زمان ولا مكان ولا يوصف  
 بوصف ولا يشار اليه باشارة  
 بل باياں اور وجوب روح کی صفت مانوس و  
 مجذب ہوتا ہی اور عقل کی صفت ان چیزوں پر  
 یقین کرنا ہی جن کا ماخذ علوم عادیہ (رسمیہ) سے  
 قریب ہو جیسے ایمان بالغیب اور توحید افعالی۔  
 اب رہا سر تو اس کا کام ان حقائق کا مشاہدہ کرنا  
 جو علوم عادیہ سے بلند بالا ہیں اس کے معنی بجز  
 اس کے کچھ اور نہیں کہ یہ اس مجرد محض حکایت  
 ہوتی ہے جو نہ زمان میں ہی اور نہ مکان میں  
 اور جو نہ کسی وصف سے موصوف کیا جاسکتا ہی  
 اور نہ جس کی طرف کوئی اشارہ ہو سکتا ہے۔

غور کیجئے حضرت شاہ صاحب کے کس خوبی اور وضاحت سے بتایا ہے کہ روح کی صفت انس اور ابخواب  
 ہے اور سر کی صفت شہود و معائنہ ہے، دوسرے لفظوں میں یہ سمجھئے کہ روح کی صفت افعالی ہے اور  
 سر کی صفت فعلی ہے، ان کیفیتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی سعادت مند روح پر جب آفتاب حقیقت پر تو  
 فگن ہوتا ہے تو اس کی شعاعیں شبنم کے قطروں کی طرح اس روح کو اپنے جلوہ گاہ انوار میں جذب کر لیتی ہیں  
 پھر عقل کا دوسرا رخ جو جانب فوق سے متصل ہے، یعنی سرزدہ ابھرتا ہے اور اب وہ اس مجرد صفت سے  
 حکایت کرنے لگتا ہے جو لا تعین رآت ولا اذن سمعت کا مصداق ہے اور جو زمان و مکان کی حد  
 بندوں سے بلند و بالا ہے۔

اس موقع پر یہ بات نہ بھولنی چاہئے کہ قلب اور عقل یہ دونوں جس طرح انبیاء میں ہوتے ہیں اور  
 انسانوں میں بھی ہوتے ہیں لیکن فرق یہ ہوتا ہے کہ انبیاء کرام میں قلب اور عقل کا وہ رخ جو روح اور سر

کہلاتا ہے اس درجہ بلند اور قوی ہوتا ہے کہ کسی اور انسان میں یہ بات نہیں ہوتی، اس بنا پر ان کو عالم فوق سے اتصال ہوتا ہے اور انہیں ایسے ایسے مقامات اور احوال و مزایا پیش آتے ہیں جو دوسروں کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتے۔ قرآن مجید میں حضور پر نور کی زبان حق تر جان سے جو ارشاد فرمایا گیا ہے: **إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ**، تو اس میں **إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ** اعضا و جوارح میں انسانوں کے ساتھ شراکت کی بنا پر ہے اور پھر **يُوحَىٰ إِلَيَّ** جو فرمایا گیا ہے تو اس میں اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب و عقل کے دو فوقانی رُخ جو حضرت شاہ ولی اللہ کی زبان میں روح اور ہنر ہیں وہ اس درجہ بلند اور ارفع ہیں کہ آنحضرت جہت و وحی ہیں۔

مگر بات یہ ہے کہ انسان، انسان ہونے کے باوجود جس طرح ایک بزدل انتہائی بہادر انسان کے شجاعانہ کارناموں کو، ایک غبی پرے درجہ کی ذکاوت و ذہانت رکھنے والے انسان کی دماغی بلند پروازیوں اور ذہنی کمالات کو نہیں سمجھ سکتا، اور جب ان کا ذکر سنتا ہے تو حیرت و استعجاب سے انگشت بندھاں ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی طرح ”مجرد صرف“ ”ذات حق“ اور حقیقت مطلقہ سے قرب و اتصال کے باعث انبیاء کرام پر جن اسرار الہیہ و کونیہ کا فیضان ہوتا ہے، ہم لوگ جب ان کا ذکر سنتے ہیں تو ہمیں حیرت ضرور ہوتی ہے اور بسا اوقات وہ امور ہائے لئے ناقابل فہم ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ بات کبھی فراموش نہ کرنی چاہئے کہ ہائے لئے کسی چیز کا ناقابل فہم ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو سکتا کہ اس کے وجود کا انکار ہی کر دیا جائے۔ مولانا شبلی مرحوم نے صحیح بخاری کی حدیث وحی پر کلام کرتے ہوئے بالکل صحیح لکھا ہے: **بَابُ مَا نَحَرَّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ** کیا دیکھا؟ ناموس اعظم (حضرت جبریل) نے کیا کہا؟ کیا کیا مشاہدات ہوتے؟ یہ وہ نازک باتیں ہیں جو الفاظ کا کھل نہیں کر سکتیں، ایک مادر زاد اندھے کو روشنی کی حقیقت لاکھ کھول کر سمجھانے کوئی بات اسکے ذہن نشین نہیں ہوتی تو کیا محض اس بنا پر نابینا کو یہ حق حاصل ہو جاتا ہے کہ وہ روشنی کے وجود کا ہی انکار کر دے؟ یہ آواز کس کی تھی اسطورہ بالا میں جو کچھ عرض کیا گیا وہ حضرت شاہ ولی اللہ کے بیان کی روشنی میں صلی اللہ علیہ وسلم سے

کی تشریح و توضیح کے سلسلہ میں تھا۔ حضرت شاہ صاحب نے نفس آواز سے بحث نہیں کی یعنی یہ نہیں بتایا کہ یہ آواز خدا کی تھی یا فرشتہ وحی کی یا خود وحی کی آواز تھی۔ انہوں نے صرف اس امر پر روشنی ڈالی ہے کہ یہ آواز خواہ کسی کی ہو اس کو زبان نبوت گھنٹہ کی آواز سے کیوں تشبیہ دی ہے۔ اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر مختصراً اس کا بھی ذکر کر دیا جائے کہ یہ آواز کس کی تھی؟ اس باب میں سب زیادہ نمایاں مسلک امام بخاری کا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ یہ آواز خدا کی ہوتی تھی جو تمام فضائیں گونج جاتی تھی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی اور اسکو نہیں سن سکتا تھا چنانچہ صحیح بخاری کتاب التمجید میں حضرت عبداللہ بن مسعود کی یہ روایت نقل کرتے ہیں۔

اِذَا كَلَّمَ اللّٰهُ بِالْوَحْيِ سَمِعَ اَهْلُ السَّمٰوٰتِ  
 شَيْئًا فَاذْا فَرَعَ قُلُوْبُهُمْ وَسَكَنَ الصَّوْتُ  
 عَرَفُوْا اَنَّهُ الْحَقُّ وَنَادَوْا مَا ذَا قَالُ  
 رَبُّكُمْ قَالُوْا الْحَقُّ

اللہ تعالیٰ جب کلام بالوحی کرتا تو اہل سموات کچھ سنتے ہیں پھر جب ان کے قلوب سے خوف ہر اس کم ہو جاتا ہے اور آواز ٹھہر جاتی ہے تو وہ پہچانتے ہیں کہ یہی حق تھا اور وہ آپس میں نہا کرتے ہیں کہ تمہارا رب نے کیا کہا، وہ کہتے ہیں کہ حق کہا!

اس سلسلہ میں امام بخاری نے ایک اور روایت بھی نقل کی ہے جو عبداللہ بن امیہ سے مروی ہے جو فرماتے ہیں کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے ایک مرتبہ آپ نے ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے بندوں کو جمع کرے گا اور ان کو ایسی نرا دیگا کہ قریب و بعید سب اُسے یکساں سنیں گے، پھر آگے چل کر ایک باب کا ترجمہ: "وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسٰى تَكْلِیْمًا" باندھا اور اُس کے ذیل میں چند احادیث نقل کیں جن سے اس امر کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ چونکہ آیت بالا میں کَلَّمَ فعل کی تاکید مصدر تکلیم کے ساتھ لائی گئی ہے اس لئے علم نحو کے قواعد کے مطابق یہاں کلام سے مراد حقیقت ہو مجاز نہیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے دادی سینا میں جو آواز سنی تھی وہ بیچ بیچ خدا کی ہی آواز تھی۔

امام بخاری نے فرقہ جہمیہ کی تردید میں کتاب التوحید میں اور بھی احادیث پیش کی ہیں اور ان سے خدا کے لئے صوت کا ثبوت ہم پر نچایا ہے اس بنا پر صلصلة البحرس والی حدیث میں جس آواز کا ذکر ہے وہ امام بخاری کے نزدیک خدا کی ہی آواز ہے۔

ارباب تصوف و عرفان میں شیخ اکبر کا جو مقام ہے اہل علم سے پوشیدہ نہیں، وہ بھی خدا کے لئے صوت مانتے ہیں۔ چنانچہ حدیث وحی پر کلام کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اللہ کی آواز کے لئے کوئی جہت اور سمت متعین نہیں کی جاسکتی اور چونکہ گھنٹہ کی آواز کا حال بھی یہی ہے کہ وہ ہر طرف سے سُنی جاتی ہے اس بنا پر یہی صوت بالوحی کو گھنٹہ کی آواز سے تشبیہ دی گئی ہے، لیکن علماء کی اکثریت جس میں صحیح بخاری کے شارحین بھی داخل ہیں اس بات کی قائل ہے کہ یہ آواز فرشتہ وحی کے پروں کی یا فرشتہ کی زبانی وحی کی ہوتی تھی۔ حافظ ابن حجر ان میں سے پہلی شق کے قائل ہیں۔ واللہ اعلم۔

تمثل یعنی فرشتہ کا کسی وحی کا جو تھا طریقہ یہ تھا کہ فرشتہ وحی کسی انسان کی شکل و صورت میں آتا تھا اور وہ آپ انسانی شکل میں آنا سے خطاب کرتا تھا یہاں تک آپ کو وہ پوری بات یاد ہو جاتی تھی جو وہ آپ سے

کہتا تھا۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک مرتبہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آیا جس کے کپڑے بہت زیادہ سفید اور بال بہت سیاہ تھے اس پر کوئی علامت سفر بھی نہیں تھی اور ہم میں سے کوئی ایک شخص بھی اُسے نہیں جانتا تھا۔ یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آکر اس طرح بیٹھ گیا کہ اپنے گھٹنے حضور کے گھٹنوں پر ٹیک لے اور اپنے دونوں ہاتھ آپ کی رانوں پر رکھ دیئے پھر اسلام، ایمان، احسان، قیامت اور علامات قیامت سے متعلق آپ سے چند سوالات کئے۔ آپ ان سوالات کے جوابات دیتے جاتے تھے اور سائل ہر جواب پر صدقت (آپ نے سچ فرمایا) کہتا جاتا تھا، حضرت عمرؓ فرماتے ہیں ہیں بڑا تعجب ہوتا تھا کہ یہ شخص سوال کرتا ہے اور جواب ملنے پر تصدیق بھی کرتا جاتا ہے گویا کہ اُسے ان سوالات کے جوابات کا علم پہلے سے ہی تھا۔ سوال

جو اب کے ختم ہونے پر یہ شخص واپس چلا گیا تو آنحضرت نے حضرت عمرؓ سے دریافت فرمایا "تم جانتے ہو کہ یہ کون شخص تھا؟" انہوں نے جواب دیا "اللہ اور اس کا رسول اعلم ہیں" آپ نے فرمایا "یہ جبریل تھے جو تم کو دین سکھانے آئے تھے"

صحابہ میں حضرت وحیہؓ جو بصورتی اور حسن و جمال کے لحاظ سے ممتاز تھے۔ اس لئے فرشتہ وحی کبھی کبھی ان کی شکل میں بھی آتا تھا۔ صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ ایک مرتبہ جبریل ابن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور باتیں کرنے لگے۔ اس وقت آنحضرت کے پاس ام سلمہ بیٹھی ہوئی تھیں آپ نے ان سے پوچھا "یہ کون ہیں" وہ بولیں "یہ تو وحیہ ہیں" ام سلمہ کا بیان ہے کہ بخدا میں ان کو وحیہ ہی سمجھتی رہی یہاں تک کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ سنا جس میں آپ نے جبریل ابن کے آنے کی خبر دی۔ تب میں سمجھی کہ جبریل وحیہ کی شکل میں آئے تھے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ ام المومنین حضرت عائشہؓ کے ساتھ پیش آیا، ایک مرتبہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ ایک شخص سے گفتگو کر رہے ہیں جو سواری پر سوار ہے۔ جب آپ گھر واپس گئے تو ام المومنین نے پوچھا "یہ کون شخص تھا جس سے آپ گفتگو کر رہے تھے؟ ارشاد ہوا "یہ جبریل تھے انہوں نے مجھ کو حکم کیا ہے کہ میں بنو قریظہ کی طرف چلا جاؤں۔"

فرشتہ کا اپنی اصلی شکل میں آنا وحی کا پانچواں طریقہ ہے تھا کہ فرشتہ اپنی اصلی شکل میں آتا تھا اور اللہ کا پیغام آپ تک پہنچاتا تھا۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل کو ان کی اصلی شکل میں دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ واقعہ معراج میں سدرۃ المنتہی کے پاس اور ایک دفعہ کسی اور مقام پر غالباً اجیاد میں۔ بعض علماء کی رائے ہے کہ قرآن مجید میں سورہ الفخیم کی مندرجہ ذیل آیات انہیں

۱۰ باب کیف نزل الوحي

۱۱ لہ یہ واقعہ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں کیت نزل الوحي کے ماتحت نقل کیا ہے۔

دو واقعوں سے متعلق ہیں۔ معراج کے علاوہ آنحضرت نے جو جبریل امین کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا تھا اس کا ذکر ان آیات میں ہے۔

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَى  
وَهُوَ بِالْأُفُقِ الْأَعْلَى ثُمَّ دَنَا فَتَدَلَّى  
فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى فَأَوْحَى  
إِلَى عَبْدِهِ مَا أَوْحَى مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ  
مَا رَأَى افْتَرَى وَنَزَّلْنَا عَلَيَّ مَا يَدْرِي  
انکو بڑی طاقتوں والے اور مضبوط نے تعلیم دی۔ پھر وہ  
سیدھا ہو گیا اور وہ بہت اوپر آسمان کے کنارہ  
پر تھا۔ پھر وہ قریب ہوا اور ٹک گیا۔ اب فاصلہ  
دو کمانوں کے برابر یا اس سے بھی کم تھا اور اُن  
نے اپنے بندہ پر وحی کی۔ جو کہ دل نے جو کچھ دیکھا  
اُسے جھوٹ نہیں کہا۔ کیا تم لوگ پیغمبروں سے اُن  
چیزوں پر جھگڑتے ہو جو انہوں نے دیکھی ہیں۔

ان آیات میں جبریل امین کی جو صفات بیان کی گئیں ہیں سورہ تکویر میں بھی ان میں سے بعض کا ذکر ہے  
ارشاد ہے۔

إِنَّمَا لَقَوْلُ مِّن سَوْدٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ  
عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُّطَاعٍ ثَمَّ  
آمِينَ وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُونٍ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا  
بِالْأُفُقِ الْمُبِينِ  
یہ کہا ہوا ہے ایک کریم قاصد کا جو طاقتور ہے۔ اور جو  
عرش کے مالک خدا کے نزدیک مرتبہ والا ہے اسکی  
اطاعت کی جاتی ہے اور وہ وہاں امانت دار ہے  
اور تمہارے ساتھی (آنحضرت) مجنون نہیں ہیں۔  
انہوں نے فرشتہ کو افق مبین پر دیکھا ہے۔

سورہ النجم اور سورہ تکویر کی ان آیتوں پر غور کیجئے، ان میں یہ بات مشترک ہے کہ جبریل امین کی  
صفت ذی قوۃ اور امین بیان کی گئی ہے اور یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ آنحضرت نے ان کو افق اعلیٰ پر دیکھا  
ہے۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس مرتبہ فرشتہ وحی کا نزول کسی غیر معمولی اور عظیم و

جلیل شکل میں ہوا اور دوسری یہ کہ فرشتہ نے خود اپنی زبان سے وحی کا تلفظ کیا تھا، اِنَّمَا لَقَوْلِ رَسُولٍ كَرِيمٍ سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے، پھر دونوں صورتوں میں فرشتہ کے درود و نزول کے بیان کے بعد اسکی بھی تصریح کر دی گئی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا اور سنا وہ سترتا سترحق تھا اور آپ کا دل ایک ایک بات کی تصدیق کر رہا تھا اسے کوئی اشتباہ نہیں تھا۔

دوسرا واقعہ حضرت جبریل کی اصل شکل میں دیکھنے کا جو معراج میں پیش آیا اُس کا ذکر اس

آیت میں ہے۔

وَلَقَدْ رَاَهُ نَزْلَةً أُخْرَىٰ عِنْدَ  
سِدْرَةِ الْمُنْتَهَىٰ عِنْدَ مَا جَنَّاتُ الْمَأْدُ  
إِذْ يُغَشَّى الْسِدْرَةَ مَآءٍ غَشِي مَا زَاغَ  
الْبَصَرُ وَمَا طَغَىٰ

اور آنحضرت نے دوسری مرتبہ بھی اترتے ہوئے  
جبریل کو سدرة المنتہی کے پاس دیکھا ہے جسکے پاس  
جنتہ المادی ہے۔ اس وقت سدراہ پر عجیب و  
غریب انوار چھائے ہوئے تھے (مگر) نہ نگاہ بھی

اور نہ اُس نے سرکشی کی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، علماء کے ایک گروہ کا خیال یہی ہے کہ سورۃ النجم کی آیات بالادونوں واقفوں سے متعلق ہیں اور اس میں شبہ نہیں کہ حضرت عائشہ کی ایک روایت سے اس کی تصدیق و تائید بھی ہوتی ہے۔ لیکن اس مقام پر ایک شبہ یہ ہے کہ فاوحی الی عبدہ ما اوحی میں اگر اوحی کی ضمیر مرفوع مستتر کو جبریل کی طرف لٹایا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وحی کرنے والے جبریل امین ہیں حالانکہ اسی سورۃ کے شروع میں عَلَّمْنَا شَدِيدَ الْقُرْآنِ «فرما کر ان کی حیثیت موحی کی نہیں بلکہ معلم کی بتائی گئی ہے اور قرآن مجید کی دوسری آیتوں میں بھی ایماء کی نسبت اللہ تعالیٰ نے خود اپنی طرف کی ہے مثلاً ایک مقام پر ہے «وَاِنْ اهْتَدَيْتَ فَمَا يُوحِي اِلَىٰ رَبِّي» ایک جگہ ہے «ذَالِكَ مِمَّا اَوْحَىٰ اِلَيْكَ رَبُّكَ مِنْ الْحِكْمَةِ» ایک سورۃ میں ہے «وَالَّذِي اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ مِنَ الْكِتَابِ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ»

ایک مقام پر ارشاد ہوتا ہے "ذالک من ابناء الغیب نوحیبا الیک" اگر کہیں نوحی بہ صیغہ مجہول لایا بھی گیا ہے تو وہاں بھی "من ربی" فرما کر اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ ایسا اللہ تعالیٰ کا ہی فعل ہے جیسے اس آیت میں :- "قل انما اتبع ما یوحی الی من ربی" اس میں شک نہیں کہ بعض آیات میں ایجا کی نسبت خود جبرئیل امین کی طرف بھی کی گئی ہے لیکن ایسے واقع پر ان کی حیثیت رسول بھی متعین کر دی گئی ہے اور ساتھ ہی خدا کا ذکر ہے جیسے اس آیت "ویرسل رسولا فیوحی باذنیہ ما یشاء" اس سے مقصد یہ ہے کہ جہاں البتہ اس و اشتباہ کا خدشہ نہ ہو جبرئیل کی طرف ایجا کی نسبت کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

یہ اور اس طرح کے بعض اور اشکالات کے باعث سورہ النجم کی یہ آیات بھی مشکلات قرآن میں شمار کی گئی ہیں جن پر افسوس ہے کہ مفسرین اور علماء سیرت نے کچھ زیادہ توجہ نہیں کی اور جو کلام کیا ہے وہ محض سطحی اور سرسری ہے۔ اس موقع پر ہم ذیل میں مختصراً وہ تقریر نقل کرتے ہیں جو حضرت الاتاؤز مولانا سید محمد انور شاہ الکتیری نے "مشکلات القرآن" میں کی ہے اور جسے مولانا شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم کی جلد اول میں صفحہ ۳۳۵-۳۳۶ پر نقل کیا ہے۔ حضرت الاتاؤز فرماتے ہیں:-

علامہ کتیری کی تقریر | اس سورہ میں بخم ستارہ کی قسم اس لئے کھائی گئی ہے کہ اس کے بعد جو کلام ہو وہ آسمان کی خبر اور معراج وغیرہ سے متعلق ہے۔ ان آیتوں کا خلاصہ اور کتب باب یہی چیزیں ہیں ان ھو الا ووحی یوحی میں فعل بہ صیغہ مجہول لایا گیا اور موحی کی کوئی تعین نہیں کی گئی، کیونکہ ایجا رجز اللہ تعالیٰ کے کسی اور کے لئے ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ وصف خدا میں منحصر ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جو اوصاف موصوف کی ذات میں منحصر ہوں ان کا ذکر خود موصوف کے تسمیہ سے زیادہ بلند ہوگا۔ مثلاً ھر رتبا باکوہ القوہ" اس کے بعد فرمایا گیا "علمنا شدید القوی" اس میں موحی کے ذکر کے بعد معلوم کی طرف



انتقال ہے۔ کیونکہ یہاں دو گرامی شخصیتوں کا ذکر ہے، ایک اللہ تعالیٰ جو موحی ہو اور دوسرا  
 معلم جو جبریل ہیں۔ اس کے بعد معلم کے اوصاف بتائے گئے کیونکہ کلام اہل مکہ کے ساتھ  
 ہے اور یہ لوگ جبریل کی معرفت نہیں رکھتے تھے اس لئے جبریل کا فعل اور ان کی صفات  
 بیان کی گئی۔ اور یہی وہ اوصاف ہیں جو سورہ تکویر میں بھی بیان کئے گئے ہیں۔ ان آیات  
 کا مقصد گویا یہ بتانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کس طرح آتی تھی؟ اور اسکی  
 صفت کیا تھی؟

حضرت الامام نے اس کے بعد حافظ ابن قیم کی تفسیر کی روشنی میں ذوہرۃ فاستوی کے مطلب کی تشریح  
 کی ہے جس کا یہاں ذکر کرنا غیر ضروری ہے۔ پھر فتدلی کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ  
 جیسا کہ قاضی بیضاوی نے ذکر کیا ہے اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس حالت  
 میں جبریل اپنے مکان سے تجاوز نہیں ہوتے تھے۔ کیونکہ تدلی کے معنی ہیں استرسال مع لعلق  
 جیسے پھل کے ٹک آئے کہ تدلی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جبریل امین کی تدلی کی مثال اس  
 روشنی کی اتند ہے جو فضا میں پھیلی ہوئی ہو اور کسی روشندان میں سے ہو کہ بھی گزر رہی ہو،  
 اس کو دیکھنے والا اپنے گھر میں دیکھتا ہے مگر پھر بھی وہ جانتا ہے کہ روشنی اپنے موضع سے  
 منفصل نہیں ہے تدلی کے لفظ سے جب یہ معنی مراد لئے جائیں تو اس سے اس پر بھی روشنی  
 پڑتی ہے کہ حضرت جبریل کس طرح بہ صورت بشر آتے تھے۔ اس کے بعد فرمایا گیا فادحی  
 الی عبدہ ما ادحی، اس میں ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے۔ جبریل کی طرف نہیں، امام  
 طبری کے نزدیک اس کے معنی یہ ہیں "فادحی اللہ الی ما ادحی" یہی معنی امام مسلم کے  
 نزدیک مراد ہیں۔ اور امام بخاری نے شریک بن ابی نمر سے جو روایت نقل کی ہے اس  
 سے بھی یہی معنی مستفاد ہوتے ہیں امام احمد (مسند صفحہ ۱۲۱) نے ثابت عن انس کے طریق

سے جو روایت کی ہے اس سے بھی اسی معنی کی تائید ہوتی ہے۔ ان سب روایتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آیت "فادحیٰ الیٰ عبدہ ما ادحیٰ" واقعہ معراج (لیلۃ الاسراء) سے متعلق ہے۔ اس سلسلہ میں ان روایات کی مراجعت کرنی چاہئے جو ابن کثیر (ص ۳۱۵) میں بہ طریق بن ابی الکثیر اور مسند احمد ص ۳۱۴ میں امام احمد سے منقول ہیں۔

پوچھا جاسکتا ہے کہ اس صورت میں جبکہ "ادحیٰ الیٰ عبدہ ما ادحیٰ" میں ادحیٰ کا فاعل جبریل کے بجائے خدا کو بنایا جائے۔ انتشار ضائر اور انفکاک فی النظم لازم آتا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ شبہ بے بنیاد اور نادراست ہے کیونکہ ایجاہ کا وصف اللہ تعالیٰ میں منحصر ہے اور سورۃ النجم کی ان آیات میں دو کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک روحی اور دوسرا معلم اس بنا پر ادحیٰ کی ضمیر مرفوع مستتر خدا کی طرف ہی راجع ہونی چاہئے۔ مثلاً ضائر معنی میں التباس و اشتباہ کا سبب ہوتا ہے۔ اس بنا پر وہ ناجائز ہے۔ لیکن یہاں معنی میں اشتباہ کا امکان ہی نہیں۔

غلاوہ ازیں ایک بات یہ بھی ہے کہ ان آیتوں میں عطف واو کے ذریعہ سے نہیں کیا گیا ہے بلکہ وہ ایک مرتب سلسلہ ہے جس میں بعض چیزیں بعض چیزوں پر خارج میں مرتب ہوتی چلی گئی ہیں۔ اور ان سب کی انتہا اللہ پر ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے فادحیٰ الیٰ عبدہ ما

ادحیٰ "اس مضمون کے لئے بہ طور خلاصہ ہے جو ان ہوا لا ادحیٰ یوحیٰ" میں بیان کیا گیا ہے۔ اب پھر اسی مضمون کو بیان کیا جا رہا ہے جیسا کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ مِنْ کُلِّ اُمَّةٍ کیا گیا ہے۔

اس کے بعد فرمایا گیا "ما کذب الفواد ما راعی" اس کو ماقبل سے منفصل لایا گیا اور عطف نہیں کیا گیا۔ کیونکہ یہ دل سے اللہ کی رویت اور جبریل امین کی ان کی اصل شکل میں

ردیت کے مضمون پر مشتمل ہے۔ یہ دونوں روایتیں معراج سے پہلے کی ہیں پھر ما را ای میں اللہ اور جبرئیل کی ردیت کے علاوہ وہ تمام چیزیں بھی شامل ہیں جو آپ نے شب معراج میں دیکھیں۔ چنانچہ آگے چل کر فرمایا گیا ہے۔

لَقَدْ رَأَىٰ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَىٰ  
آنحضرت نے اپنے رب کی بڑی بڑی نشانیاں دیکھیں  
سورہ نبی اسرائیل میں ذکر ہے۔

لِنُرِّيَهُ مِنْ آيَاتِنَا  
تاکہ ہم آپ کو اپنی آیات دکھائیں۔  
پھر اسی مقام پر ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الدُّرُودَ الَّتِي آذَرْنَاكَ  
اور جو رو دیا ہم نے آپ کو دکھایا ہے ہم نے اُس کو  
إِلَّا فِتْنَةً لِلنَّاسِ  
لوگوں کے لئے آزمائش کی چیز بنایا ہے۔

اس آیت میں جو فتنہ ہے یہ وہی ماراۃ (جھگڑانا) ہے جس پر "افتمار و نفا علی فایروی  
زرا کر مارات کرنے والوں کو زبرد تو بیچ کی گئی ہے۔

اس تقریر سے یہ بات واضح ہو گئی ہوگی کہ ما کذب الفواد ما را ای کی تقدیر عبارت یوں ہے

ما کذب الفواد عبد ناما را ای اس را ای کا فاعل عبد یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ روایت عام ہے خواہ دل کے ذریعہ سے ہو یا آنکھ کے ذریعہ۔ اس صورت میں کذب متعدی بد و مفعول ہوگا اور اس میں کوئی دشواری نہیں کیونکہ تکذیب کی طرح کذب بھی متعدی بد و مفعول ہو کر آتا ہے مثلاً یوں کہیں صدقت فلانا الحدیث و کذبہ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کو ایک مفعول پر ہی مقتصر مانا جائے۔ جیسا کہ امام نووی نے فرما سے نقل کیا ہے۔ اس صورت میں یہ معنی ہونگے کہ دل نے اس معاملہ میں جھوٹ نہیں کہا بلکہ اس نے وہی کہا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شب معراج میں عیاناً دیکھا۔

آگے چلے ارشاد ہوتا ہے "وَلَقَدْ رَأَىٰ نَزْلَةَ الْخُرُوبِ" اس میں اگر را ای کا فاعل آنحضرت

کو نہیں بلکہ فواد کو بنایا جائے تو یہ زیادہ واضح بات ہوگی اور اب اس صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ قلب نے جو کچھ دیکھا تھا اس کو من و عن بیان کر دیا اور اس میں جھوٹ نہیں کہا۔ یہاں رویت سے مراد رویت فواد ہوگی اور بعد میں جو رویت بصر کا ذکر ہے تو واضح رہنا چاہئے کہ ان دونوں میں کوئی تضاد اور تباہی نہیں ہے کیونکہ رویت امر واحد ہے خواہ دل سے ہو یا آنکھ سے فرق صرف فاعل کا ہے اس لئے عبارت میں الفکاک اور نظم میں انشا پر پیدا نہیں ہوتا۔

مرفوع احادیث اور صحیح آثار سے بھی پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کی طرف سے دو مرتبہ ہوئی ہے ایک مرتبہ دل سے اور دوسری مرتبہ آنکھ سے ما کذب الفواد ما رآئی کے بعد افعار و نفا علی ما یرئی ہے اس میں بجائے سینہ ماضی کے یرئی بصیغہ مضارع فرمایا بھی اس پر دلالت کرتا ہے کہ یہ رویت اولیٰ کے علاوہ کوئی اور رویت ہے۔ حضرت ابن عباس کا ایک اثر ہے اس سے بھی اس کی ہی تائید ہوتی ہے آپ فرماتے ہیں: محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے رب کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ ایک مرتبہ آنکھ سے اور دوسری مرتبہ دل سے، علامہ طبرانی نے اس اثر کو اوسط میں نقل کیا ہے اور سوائے جوہر بن منصور الکوفی کے اسکے تمام راوی صحیح کے زواہر ہیں، جوہر بن منصور کو بھی ابن جان نے ثقات میں شمار کیا ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں: "ولقد رآنا نزلة اخدی" میں جو رویت ہے وہ خدا اور جبریل دونوں سے متعلق ہے۔ جبریل امین کی رویت تو ظاہر ہے۔ اللہ کی رویت اسنے کی صورت میں یہ کہہ پڑیگا کہ جس طرح بعض احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ خدا رات کے ثلث آخر میں سارو دنیا پر نزول اجلال فرماتا ہے۔ اسی طرح اس آیت میں بھی نزلة اخدی کے معنی نزول الہی کے ہو سکتے ہیں۔ اب رہا روایت عند سدرۃ المنتہی، تو یہ واضح رہنا چاہئے کہ ظرف یعنی عند سدرۃ المنتہی مرئی کے ساتھ متعلق نہیں بلکہ رویت کے ساتھ ہے جیسے کہتے ہیں: "رأیت الہلال عند المسجد" اس فقرہ کی بنا پر عند سدرۃ المنتہی آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام کو متعین کرتا ہے نہ کہ جبریل یا خدا کے مقام کو۔  
 حضرت الاتاذ کی یہ تقریر نہایت مفصل ہے۔ اور آپ نے اُس میں عجیب و غریب نکات و  
 لطائف مستند حوالوں کی روشنی میں بیان کئے ہیں۔ ہم نے مذکورہ بالا انتخاب میں جس جہت وہی فقرے  
 نقل کئے ہیں جو ہائے موضوع بحث سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس تقریر سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے  
 کہ سورہ النجم کی آیات بمحوش عنھا صرف واقعہ معراج سے متعلق ہیں اور ان میں لیلۃ الاسراء کے  
 ہی احوال و کیفیات کو نہایت بلیغ پیرایہ میں بیان کیا گیا ہے۔ لیکن چونکہ وحی اس واقعہ کی ابتدائی  
 منزل ہے اس لئے شروع میں وحی کی صفت اور اُس کی کنیت و امکان پر روشنی ڈالی گئی ہے  
 آیات النجم کی مذکورہ بالا تفسیر کے مطابق حضرت جبریل کی اُن کی اصلی شکل میں روایت ایک تو  
 وہ ہے جو معراج میں ہوئی۔ اب رہی دوسری روایت جس کا ذکر حضرت عائشہ نے کیا ہے تو اسکی نسبت  
 مختلف روایتیں ہیں حضرت عائشہ کی ہی ایک روایت سے ثابت ہوتا ہے کہ دوسری روایت کا واقعہ ایک  
 مقام پر جس کا نام اجاود ہے پیش آیا تھا۔ بعض روایتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غار حرا میں آپ پر جب  
 پہلی وحی اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ "نازل ہوئی تو اُس دفعہ جبریل اپنی اصلی شکل میں ہی تشریف لائے تھے۔  
 ہمارے نزدیک یہی صحیح ہے اور بخاری کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ہم ذیل میں پوری  
 حدیث نقل کرتے ہیں تاکہ اس خاص مسئلہ کے علاوہ وحی کی بعض اور کیفیات پر بھی روشنی پڑ جائے۔

”حضرت عائشہ ام المؤمنین سے روایت ہے کہ سب سے پہلی وحی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
 پر نازل ہوئی وہ خواب میں بہ صورت رویا صالکہ تھی، آنحضرت جو خواب دیکھتے تھے وہ صبح کے روشن  
 آجائے کی طرح صبح نکلتا تھا۔ پھر آپ کو تنہائی محبوب ہو گئی، غار حرا میں جا کر آپ تنہا کچھ دن بسر کرتے تھے  
 اور گھرانے سے پہلے کئی کئی شب عبادت میں مصروف رہتے تھے، کھانے پینے کی چیزیں بھی ساتھ لجاتے تھے

لے پوری تقریر کے لئے دیکھو مشکلات القرآن مطبوعہ علمی ڈبجیل از صفحہ ۲۴۰ تا ۲۶۲

جب وہ سامان ختم ہو جاتا تو گھرواپس آئے۔ اور پھر نیا سامان لے کر غار میں تشریف لے جاتے۔ یہاں تک کہ غار میں ہی حق آپ کے سامنے آیا اور وہ فرشتہ، آپ کے پاس پہنچا اور اُس نے کہا، ”پڑھ، آس نے فرمایا، میں پڑھا ہوا نہیں ہوں“ حضور فرماتے ہیں، ”اب اُس فرشتہ نے مجھ کو پکڑ کر اتنا دبایا کہ میں تھک گیا۔ پھر اُس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا، ”پڑھ، میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں“ اب اُس فرشتہ نے مجھ کو پکڑ لیا اور پھر دبایا یہاں تک کہ میں تھک گیا۔ پھر اُس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور کہا، ”پڑھ، میں نے پھر وہی جواب دیا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں“ فرشتہ نے تیسری مرتبہ پھر مجھ کو پکڑا اور چھوڑ دیا اور کہا۔

اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ  
الْانسانَ مِنْ عَلَقٍ، اِقْرَأْ وَرَبُّكَ  
الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْانسانَ  
مَا لَمْ يَلْعَلِمُ

پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے پیدا کیا ہے  
جس انسان کو جسے ہوئے خون سے پیدا کیا ہے، پڑھ  
اور تیرا پروردگار بڑا بزرگ ہے جس نے قلم کے ذریعہ سکھایا  
اور انسان کو وہ کچھ سکھایا ہے جسے وہ نہیں جانتا تھا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان آیتوں کے ساتھ گھر واپس آئے۔ قلب مبارک لرز رہا تھا، حضرت خدیجہ بنت خویلد کے پاس آئے اور فرمایا، ”مجھ کو کیبل اڑھا دو“، ”مجھ کو کیبل اڑھا دو“ لوگوں نے آپ کو کیبل اڑھا دیا یہاں تک کہ دہشت کی وہ حالت جاتی رہی۔ پھر آپ نے حضرت خدیجہ سے سارا ماجرا بیان کیا اور فرمایا کہ مجھ کو اپنی جان کا خطرہ ہے۔ حضرت خدیجہ بولیں ہرگز نہیں خدا آپ کو کبھی رسوا نہیں کریگا آپ قرابت و اربوں سے صلہ رحمی کا برہاؤ کرتے ہیں۔ لوگوں کا بوجھ خود اٹھاتے ہیں۔ اپاہیوں اور محتاجوں کے لئے کمائی کرتے ہیں۔ جانوں کی همان داری کرتے ہیں مصائب و حوادث میں آپ حق کی امداد و اعانت کرتے ہیں، پھر وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو لیکر ورقہ بن نوفل کے پاس آئیں جو حضرت خدیجہ کے چچا زاد بھائی تھے اور جنہوں نے عہد جاہلیت میں عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔

یہ انجیل کو عبرانی میں لکھتے تھے جناب بھی لکھ سکتے تھے بڑے بہت تھے۔ بصارت جاتی رہی تھی حضرت خدیجہ نے ان سے کہا "بھائی! ذرا اپنے بھتیجے کی توسنو" ورقہ بولے "بھتیجے! بتاؤ تم کیا دیکھتے ہو؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ دیکھا تھا کہ سنایا، ورقہ بولے "یہ وہی ناموس (محرم اسرار) ہے جسکو اللہ نے موسیٰ پر نازل کیا تھا۔ اے کاش میں اُس وقت جوان ہوتا، اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جبکہ تمہاری قوم تم کو نکال دیگی" آنحضرت نے پوچھا "کیا میری قوم مجھ کو نکال دیگی؟" انہوں نے جواب دیا۔ "ہاں! جو چیز تم لے کر آئے ہو وہ ایسی چیز ہے کہ جو کوئی اُس کو لیکر آیا اُس کے ساتھ دشمنی کی لگی اور اگر میں اس روز تک زندہ رہا تو میں تمہاری مدد کروں گا۔ نہایت قوی اور مضبوط مدد۔ اس واقعہ کو پیش آنے چند روز ہی ہوئے تھے کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا۔"

اس واقعہ میں اگرچہ اس کا ذکر نہیں ہے کہ فرشتہ وحی صلی شکل میں نازل ہوا تھا یا کسی انسانی صورت میں آیا تھا لیکن حضور کا جبریل کو فرشتہ کہنا، ان کی آمد سے خوف زدہ ہو جانا، اور جبریل کے دبانے سے آپ کا تعجب زدہ ہو جانا یہ سب اس امر کے قرائن ہیں کہ فرشتہ وحی کا نزول اپنی صلی شکل میں ہوا تھا، ساتھ ہی اس پر غور کرو کہ حضور کا اس واقعہ سے غیر معمولی طور پر متاثر ہونا اور پھر ورقہ کا تسلی و تشفی کرنا کس طرح صاف صاف بتا رہا ہے کہ حضور کو جو وحی الہی پہنچی آپ پہلے سے اس سے باخبر نہیں تھے اور یہ جو کچھ ہوا محض خدا کے حکم سے اور آپ کے اپنے ارادہ کے بغیر ہوا۔ کیا سید کوئین کے پیغمبر ہونے اور آپ کے پیغام کے وحی الہی ہونے کی کوئی نفسیاتی دلیل اس سے بڑھ کر ہو سکتی ہے؟

اس واقعہ میں ورقہ بن نوفل نے جو کچھ کہا ہے اور جن طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی ہے اُس کے پیش نظر تمام علماء اسلام کا اتفاق ہے کہ وہ مومن تھے۔ یہاں تک کہ بعضوں نے تو ان کو صحابہ میں بھی شمار کیا ہے البتہ اس میں تردد ہے کہ آیا وہ اس امت میں بھی شمار ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ دعوت اسلام سے ظہور سے پہلے ان کی وفات ہو گئی تھی۔

پچھٹا طریقہ وحی ایک طریقہ وحی یہ بھی تھا کہ اللہ تعالیٰ بغیر کسی فرشتہ یا آواز کے توسط کے براہ راست آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر وحی نازل فرماتے جیسا کہ لیلۃ المعراج میں پانچ نمازوں کو فرض کیا گیا۔

ساتواں طریقہ وحی ایک طریقہ وحی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی فرشتہ کی وساطت کے بغیر کلام کرے جیسا کہ از روئے نص قرآن حضرت موسیٰ کے لئے ثابت ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے بھی معراج میں ثابت ہے۔

حافظ ابن قیم وحی کے یہ سات طریقے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ بعض علمائے ان طریقوں پر ایک اور طریقہ کا اضافہ کیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ پس پردہ و حجاب نہیں بلکہ تمام حجابوں کو اٹھا کر نظروں کے سامنے جلوہ نما ہوا در شرف خطاب و کلام عطا فرمائے علامہ فرماتے ہیں کہ یہ طریقہ وحی ان لوگوں کے نزدیک تو متحقق ہے جو اس بات کے قائل ہیں کہ سید اولادِ آدم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی چشم مبارک دیدارِ الہی سے شاد کام و فائز المرام ہوئی تھی، لیکن یاد رکھنا چاہئے کہ یہ مسئلہ علماء سلف و خلف میں مختلف فیہ رہا ہے در روایتیں دونوں قسم کی ہیں، اگرچہ اس بارہ میں جمہور صحابہ بلکہ سب کے سب ہی حضرت عائشہ کے ساتھ لکھا حکاۃ عثمان بن سعید الدراری۔

آنحضرت اور مسئلہ رویتِ باری کی تحقیق سورہ النجم میں جو آیات وحی سے متعلق ہیں چونکہ ان میں رویتِ باری کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس لئے نامناسب نہ ہو گا اگر اس موقع پر اس مسئلہ کو کسی قدر تفصیل سے بیان کر دیا جائے جیسا کہ علامہ ابن قیم نے فرمایا ہے یہ مسئلہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج میں باری تعالیٰ کی رویتِ بصری ہوئی یا نہیں۔ علماء سلف و خلف میں مختلف رہا ہے اور وجہ اختلاف یہ ہے کہ آثار و روایات مثبت و منفی دونوں طرح کی ہیں یہ صحیح ہے کہ حضرت عائشہ کا مسلک اس باب میں ہی تھا



وہ روایت کی نفی کرتی تھیں۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت مسروق سے روایت ہے کہ میں حضرت عائشہ کے پاس ٹیک لگائے بیٹھا تھا کہ ام المومنین نے فرمایا: ابو عائشہ! تین باتیں ایسی ہیں جن میں سے اگر کسی ایک کا بھی کوئی شخص قائل ہو تو اُس نے خدا پر بڑا بہتان باندھا۔ میں نے پوچھا: وہ کیا باتیں ہیں؟ ارشاد ہوا: جس شخص نے یہ کہا کہ محمد نے خدا کو دیکھا اُس نے خدا پر بڑی تمہت لگائی، مسروق کہتے ہیں میں تیکہ لگائے بیٹھا تھا یہ سن کر اٹھ بیٹھا اور عرض کیا: اے ام المومنین! آپ ذرا مجھ کو ہمت دیکھئے اور جلدی نہ کیجئے کیا اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا

لَقَدْ رَأَىٰ بِالْأَفْقِ الْمُبِينِ وَلَقَدْ رَأَىٰ  
نُورًا أَخْرَجِي  
اور آپ نے اُس کو افق مبین پر دیکھا اور آپ نے  
اُس کو دوبارہ اُترتے ہوئے دیکھا۔

حضرت عائشہ نے جواب دیا: سب سے پہلے میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی نسبت سوال کیا تھا تو آپ نے فرمایا کہ اس سے مراد جبریل علیہ السلام ہیں جن کو میں نے ان دو مرتبوں کے علاوہ ان کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھا، میں نے اُن کو آسمان سے اُترتے ہوئے اس طرح دیکھا کہ انہوں نے زمین و آسمان کے درمیان کی تمام فضا کو گھیر لیا تھا۔ اس کے بعد ام المومنین نے فرمایا: کیا تم نے نہیں سنا اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ  
الْاَبْصَارَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ  
نگاہیں اُس کو نہیں پاسکتی اور وہ نگاہوں کو  
پالیتا ہے اور وہ لطیف و خبیر ہے۔

کیا تم نے نہیں سنا اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا  
وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ  
رَسُوْلًا  
کسی بشر کی مجال نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس سے  
کلام کرے مگر وحی کے ذریعہ پالیں پر وہ یا اس  
طرح کہ وہ رسول کو بھیجے۔

اس کے برخلاف بعض روایتوں سے اس سوال کا جواب اثبات میں ملتا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت انس سے شریک بن عبداللہ نے جو روایت کی ہے اُس کے آخر میں ہے۔

حَتَّى جَاءَ سِدْرَةَ الْمُنْتَهَى وَدَنَا نَجَّارٌ  
رَبُّ الْعِزَّةِ فَتَدَلَّى حَتَّى كَانَ مِنْهُ  
قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَى (کتاب الحجید)

صحابہ میں جو حضرات روایت کا ثبوت مانتے تھے اُن میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کو خاص امتیاز ہے

ایک مرتبہ انھوں نے حضرت عکرمہ کی موجودگی میں فرمایا: «رَأَى مُحَمَّدٌ رَبَّهُ» محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اپنے رب کو دیکھا ہے۔ عکرمہ بولے کہ اللہ کا ارشاد نہیں ہے: «لَا تَدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ» فرمایا: ہاں سچ ہے لیکن اس وقت جبکہ خدا اپنے اصلی نور میں جلوہ فرور ہو، آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے خدا کو دو مرتبہ دیکھا ہے۔ (ترمذی باب التفسیر سورۃ النجم) ترمذی میں ابوسلمہ سے روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے آیت «وَلَقَدْ رَاَهُ نَزَلًا أُخْرِجُوا مِنْهَا فَيُرَوِّدُ الْوَادِعَةَ الْاُولَىٰ وَقَدْ رَاَهُ نَزَلًا أُخْرِجُوا مِنْهَا فَيُرَوِّدُ الْوَادِعَةَ الْاُولَىٰ» کی تلاوت کرنے کے بعد فرمایا:

وَقَدْ رَاَهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ

صحیح مسلم و ترمذی میں حضرت ابو ذر غفاری سے روایت ہے کہ انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دریافت کیا: یا رسول اللہ! آپ نے خدا کو بھی کو دیکھا ہے؟ فرمایا: «وہ تو نور ہے، میں اُسے کہاں دیکھ سکتا ہوں» اس روایت سے یہ ظاہر روایت کی نفی کا مضمون ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عباس کے الفاظ میں اس کا جواب بھی دیا جاسکتا ہے کہ آپ کا یہ فرمانا کہ میں اُس کو کہاں دیکھ سکتا ہوں، اُس وقت کے لئے مخصوص ہے جبکہ خدا اپنے اصلی نور میں جلوہ فرور ہو۔ چنانچہ صحیح مسلم (رج اباب الاسراء) اور ترمذی (تفسیر سورۃ النجم) میں ایک روایت ہے جس میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) فرماتے ہیں: «میں نے صرف ایک نور دیکھا تھا۔ گویا حضرت عائشہ جس آیت سے روایت باری

کے عدم امکان پر استدلال کرتی ہیں یعنی لا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْأَبْصَارَ وَهُوَ غَيْرُ مُسْتَضَاءٍ  
 اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ لا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ کے معنی یہ ہیں کہ نگاہیں حضرت باری عزوجل کا احاطہ  
 نہیں کر سکتی اور وہ اس ذاتِ بے ہمتا و بے مثال کو اس طرح نہیں دیکھتیں جس طرح کہ وہ کسی ممکن چیز  
 کو دیکھ لیتی ہیں اس بنا پر حضور پر نور کا نورِ آبی اُذْأُكَا فرمانا بھی اسی مراد پر محمول کرنا چاہئے۔  
 پھر وہ حضرات جو ثبوتِ رویت کے قائل ہیں، اُن کا ایک استدلال یہ بھی ہے کہ قرآن مجید

کی نص۔

وَجُودًا يَوْمَئِذٍ نَاصِرَةٌ أَلِيٌّ رَّبِّهَا  
 اس دن چہرے تر و مازہ ہوں گے اور اپنے  
 رب کو دیکھ رہے ہوں گے۔  
 نَاطِلَةٌ

اور دوسری آیات و احادیث کے مطابق اہل سنت و جماعت کے نزدیک اتنا تو مسلم ہے ہی کہ  
 آخرت میں اہل جنت کو اللہ تعالیٰ کا دیدار ہوگا۔ پس جب آخرت میں عام اہل جنت دیدار الہی کی  
 نعمت و دولت سے شرف اندوز ہو سکتے ہیں تو اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس دنیا میں یہ  
 امتیاز حاصل ہو گیا ہو تو اس میں استبعاد کی کیا بات ہے۔

حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس نزاع کو دور کرنے کی ایک صورت یہ تجویز کی ہے کہ  
 حضرت ابن عباس سے اس معاملہ میں جو روایات منقول ہیں وہ دو طرح کی ہیں ایک مطلق اور دوسری  
 مقید۔ مطلق تو وہ ہی روایات ہیں جو اوپر گزر چکی، اور جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے مطلق  
 دیدار الہی کا خواہ چشم ظاہر کے ذریعہ ہو یا چشم قلب سے، ذکر ہے۔ ان روایات کے ساتھ ہی بعض  
 روایات ہیں جن میں مطلق نہیں بلکہ مقید رویت کا ذکر ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ابوالعالیہ کی سند سے مذکور  
 ہے کہ حضرت ابن عباس نے: "مَا كُنَّا نَرَى الْفُؤَادَ مَا رَأَى وَلَقَدْ رَأَى نَزْلَةَ الْخُرْقِيِّ كَيْفَ تَفْسِيرِ  
 میں فرمایا۔"

رأى ربنا بفؤادِهِ مَرَّتَيْنِ  
آنحضرت نے اپنے رب کو چشم قلب سے دو مرتبہ دیکھا

حضرت عطاء کی سند سے ہے کہ حضرت ابن عباس نے فرمایا

رأى قلبیه  
آنحضرت نے خدا کو اپنے قلب کی آنکھ سے دیکھا تھا

ابن مردویہ نے اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ بہ طریق عطاء نقل کیا ہے۔

لم يَرَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ  
بِعَيْنِهِ إِنَّمَا رَأَى قَلْبِيهِ  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کو آنکھ سے  
نہیں دیکھا، بلکہ دل سے دیکھا تھا۔

پس حضرت ابن عباس کی جن روایتوں میں مطلق روایت کا ذکر ہے۔ اور چشم یا قلب کسی کی تصریح نہیں ہے۔ اگر متعین روایات کے پیش نظر ان کو بھی روایت بالفواد پر محمول کر لیا جائے اور ساتھ ہی حضرت عائشہ کی روایات میں جو روایت کی نفی ہے۔ اُس کو روایت بالعین پر محمول کر لیا جائے تو اب کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ کیونکہ ثبوت روایت جس اعتبار سے ہے اُس اعتبار سے نفی روایت نہیں اور حضرت عائشہ جس روایت کی نفی کرتی ہیں یعنی روایت بالبصر حضرت ابن عباس اُس کے قائل نہیں۔

ظاہر ہے کہ جہاں تک روایات و آثار کا تعلق ہے۔ حافظ ابن حجر کی اس تقریر سے حضرت ابن عباس اور ام المومنین حضرت عائشہ کے اس نزاع کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ قرآن مجید سے تو روایت بصری کا پتہ چلتا ہے چنانچہ ارشاد ہے۔

مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغَى  
قوت نیائی میں نہ تو کچی پیدا ہوئی اور نہ اُس نے

سرکشی کی۔

ہماری رائے میں اس موقع پر حضرت الاستاذ مولانا السید محمد نور شاہ الکتیری نے جو تقریر

کی ہے وہ اس مشکل کا بہترین حل ہے ہم اُسے مختصراً ذیل میں نقل کرتے ہیں، آپ فرماتے ہیں  
 ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یقیناً روایت ہوئی تھی۔ لیکن بات یہ ہے کہ روایت ایک طرح  
 کی ہی نہیں ہوتی بلکہ اُس کی مختلف نوعیتیں ہوتی ہیں نوعیتوں کے اس اختلاف کی وجہ سے ایک طرح کی  
 روایت کا ثبوت دوسری نوع کی روایت کی نفی ہو سکتا ہے مثلاً ایک دوست اپنے دوست کو دیکھتا ہے  
 ایک خادم اپنے مخدوم کو دیکھتا ہے۔ ایک ادنیٰ درجہ کا آدمی ایک جلیل القدر بادشاہ کی دید کرتا ہے،  
 آپ دیکھتے ہیں کہ ان سب مثالوں میں ایک روایت دوسری روایت سے بالکل مختلف طرز لقیہ پر پائی  
 جا رہی ہے۔ پس اسی طرح ہم کہتے ہیں کہ معراج میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت باری عز اسمہ  
 کی جو دید ہوئی تھی وہ ایک خاص طرح کی دید تھی جس کو ہم دنیا کی کسی دید پر بھی قیاس نہیں کر سکتے۔ اس  
 بنا پر ہمارا دید کا اثبات اور نفی دونوں صحیح ہوں گے۔ اثبات ایک خاص دید کے لحاظ سے ہے اور نفی  
 دنیوی دید کے اعتبار سے۔ اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ اثبات نفی روایت میں تنافی اور تضاد نہیں ہے بلکہ  
 دونوں مراد کی ایک طرف کو ظاہر کرتے ہیں“

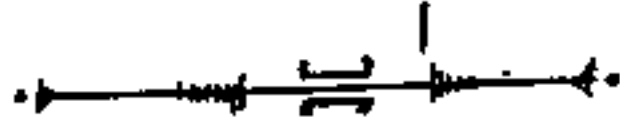
اس کے بعد حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں ”آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روایت باری  
 کو اگر تمثیلاً بیان کیا جاسکتا ہے تو یوں کہہ سکتے ہیں کہ آپ کی چشم اشتیاق و تمنائے ذات احدیت  
 کے جمال بے مثال کا نظارہ اس طرح کیا کہ جس طرح ایک عاشق اپنے محبوب کا یا ایک باادب نوکر اپنے آقا  
 کا کرتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں دیکھنے والا اپنی نگاہ کو روک بھی نہیں سکتا، اور ساتھ ہی اسکی مجال  
 یہ بھی نہیں ہوتی کہ وہ آنکھیں جا کر مشاہدہ کرے۔ قرآن مجید میں اس روایت کے سلسلہ میں جو مازاذاع لہجہ  
 و ماطغیٰ فرمایا گیا ہے۔ تو اُس میں روایت کی اس خاص کیفیت و نوعیت کی ہی طرف اشارہ کرنا مقصود  
 ہے۔ چنانچہ ”مازاذاع“ کا مطلب یہ ہے کہ چشم مجھری نے جمال الہی کے دیکھنے میں تفاعل و شامح  
 کو بالکل روا نہیں رکھا۔ پھر ماطغیٰ سے مراد یہ ہے کہ باوجود کمال اشتیاق کے چشم مجھری کے لئے یہ

نامکن تھا کہ وہ دائرہ ادب سے باہر قدم رکھے۔ یعنی اپنی نگاہیں جمالِ ربانی پر جما دے۔ کسی عربی شاعر نے کہا ہے۔

اشْتِاقٌ فَإِذَا بَدَا أَطْرَقَتْ مِنْ إِجْلَالِهِ

ترجمہ:- میں اُس کا اشتیاق دید ہوں، لیکن جب وہ ظاہر ہوتا ہے تو میں اُس کی جلالت

شان کی وجہ سے سرنگوں ہو جاتا ہوں



## قرآن اور وحی

چونکہ تمام اعتقادات اور ایمان و عمل کا دار و مدار اس یقین پر ہے کہ پیغمبر کی زبان حق تر جان سے جو کچھ ادا ہو رہا ہے وہ بجانب اللہ ہے اور جن احکام کے اتباع کا حکم دیا جا رہا ہے وہ سب اللہ تعالیٰ کے ہی ارشاد فرمائے ہوئے ہیں اس لئے ہر آسمانی مذہب کا فرض ہے کہ وہ اپنے احکام کی تعلیم و تلقین سے پہلے لوگوں کو اپنے آسمانی ہونے کا یقین دلانے۔ اور اسلام چونکہ دنیا کا آخری اور سب سے زیادہ کامل و مکمل مذہب ہے اور اُس کی دعوت کسی خاص ملک و قوم کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ اس بنا پر تمام سماوی ادیان و مذاہب میں یہ امتیازِ خصوصی صرف قرآن مجید کو حاصل ہے کہ جن تکرار و تاکید سے اُس نے اپنا منزل من اللہ ہونا بیان کیا ہے کسی اور کتاب نے اپنی نسبت اس شد و مد اور تاکید و تکرار سے نہیں بیان کیا۔

قرآن کے منزل من اللہ ہونے پر تجوی | جو لوگ اُس کے منزل من اللہ ہونے پر شک کرتے ہیں انکو تجوی کی گئی۔ ارشاد ہے۔

وَإِنْ كُنْتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا  
فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّثْلِهِ وَادْعُوا شُهَدَاءَكُمْ  
كُم مِّن دُونِ اللَّهِ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ

تم سچے ہو۔

پھر اسپر ہی بس نہیں بلکہ سخت تہدید کے انداز میں فرمایا جاتا ہے۔

فَان لَّمْ تَفْعَلُوا وَلَنْ تَفْعَلُوا فَاتَّقُوا  
النَّارَ الَّتِي وُقِدَتْ لَهَا النَّاسُ وَاِجْزَاءُ  
اَعْدَاتِ الْكٰفِرِيْنَ  
اور اگر تم ایسا نہ کرو یعنی قرآن کی کسی سورت کا  
مثلاً لاؤ، اور تم ایسا ہرگز نہیں کر سکتے تو ڈرو  
اُس آگ سے جس کا ایندھن لوگ اور پتھر  
ہونگے جو کافروں کے لئے تیار کی گئی ہے۔  
(بقرہ)

ایک مقام پر ہے۔

قُلْ لَنْ اَجْمَعِيَ الْاِنْسَ وَاِجْنَ  
عَلٰى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ  
لَا يَّاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَاَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ  
بِعَضٍ ظٰهِيْرًا (بنی اسرائیل)  
راے نبی) آپ کہہ دیجئے کہ اگر انسان اور جن  
اس قرآن کا مثل لائے پر متفق ہو جائیں تب بھی  
وہ اس کا مثل نہیں لاسکیں گے، اگرچہ وہ ایک  
دوسرے کے مددگار ہو جائیں۔

ایک جگہ قرآن مجید کو منزل من اللہ نہ ماننے والوں کو جو اسے خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
کا کلام کہتے تھے اس طرح تحدی کی گئی ہے۔

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلٰى قُلُوْبِنَا  
بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَاَدْعُوْا  
اَسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْ يَّكْتُمَ  
صَادِقِيْنَ (رہن)  
کیا وہ کہتے ہیں کہ اس نے (نبی نے) خود اسے گھڑ  
لیا ہے۔ آپ کہہ دیجئے کہ اچھا اگر ایسا ہے تو تم  
اس جیسی ایک سورۃ لے آؤ اور اللہ کے سوا  
جن کو تم بلا سکتے ہو بلا لو اگر تم سچے ہو۔

یہ لوگ جو قرآن مجید کو اللہ کا کلام نہیں مانتے ان کی نسبت فرمایا گیا کہ یہ محض اپنی کوتاہ علی اور ناقصیت  
کے باعث ایسا کہتے ہیں۔ اور اس امر کی نسبت جھوٹ بڑھتے ہیں جسے یہ خود نہیں جانتے۔ آیت بالا  
کے بعد ہی ارشاد ہوتا ہے۔

بَلْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمُحِيطُوْا بِعِلْمِهٖ وَاَمَّا  
بَلْ كَذَّبُوْنَ لِيْ سِيْرًا لِّيَكْتُزِبُوْا كَلِمٰتِ  
ہیں انہوں نے ایسی چیز کی تکذیب کی ہے جس کے



یا تَهْمُرُ تَأْوِيلَهُ طَائِفَاتُ كَذَّبَ  
 الذِّينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانظُرْ كَيْفَ كَانَ  
 عَاقِبَةُ الظَّالِمِينَ (زمر)

علم کا اعطاء انہوں نے نہیں کیا اور جس کی اصل  
 حقیقت ان کے سامنے نہیں آئی، اسی طرح ان  
 لوگوں سے پہلے بھی لوگوں نے تکذیب کی ہے  
 پس آپ دیکھئے کہ ظالموں کا انجام کیا ہوا۔

ایک جگہ فرمایا گیا ہے۔

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ فَاتُوا  
 بَعْضَ سُوَرٍ مِثْلِهِ مُفْتَرِيَةً وَادْعُوا  
 مَنْ اسْتَطَعْتُمْ مِنْ دُونِ اللَّهِ إِنْ  
 كُنْتُمْ صَادِقِينَ . فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا  
 لَكُمْ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا أُنزِلَ بِعِلْمِ اللَّهِ  
 وَأَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ فَهَلْ أَنْتُمْ  
 مُسْلِمُونَ (ہود)

کیا وہ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے خود قرآن گھڑ لیا  
 ہے، آپ کہہ دیجئے کہ اچھا اس طرح کی دس  
 گھڑی ہوئی سورتیں ہی لے آؤ اور اللہ کے سوا  
 جن لوگوں کو تم بلا سکو بلاؤ اگر تم سچے ہو، اور اگر  
 وہ کچھ جواب نہ دیں تو جان لو کہ وہ اللہ کے علم  
 سے آوارا گیا ہے اور یہ کہ سوائے خدا کے کوئی  
 دوسرا معبود نہیں ہے، تو کیا تم اطاعت قبول  
 کرنے والے ہو۔

اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان منکرین کی ہوا پرستی کا اس طرح یقین دلایا جاتا ہے  
 فَإِنْ لَمْ يَسْتَجِيبُوا لَكَ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا  
 يَتَّبِعُونَ أَهْوَاءَهُمْ وَمِنْ أَفْضَلُ  
 فَمَنْ أَتَّبِعْ هُوَ لَا يَغِيْرُ هُدًى مِنْ  
 اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ  
 الظَّالِمِينَ (التقصص)

راے غمخیز، اگر وہ لوگ آپ کو جواب نہ دیں تو آپ  
 جان لیں کہ یہ لوگ صرف اپنی خواہشوں کا اتباع  
 کرتے ہیں اور ان لوگوں سے زیادہ گمراہ کون سا  
 جو اللہ کی ہدایت کے بغیر اپنی خواہشات کی  
 پیروی کرتے ہوں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ ظالموں

ہدایت نہیں دیتا

بعض جزئی واقعات قرآن مجید کے وحی ہونے پر استدلال کی گئی ہے اور منکرین کے عجز سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں، بلکہ اللہ کی طرف سے نازل کی ہوئی وحی ہے۔ ان آیات کے علاوہ بکثرت دوسری آیتیں بھی ہیں جن میں قرآن مجید کے وحی ہونے پر بعض جزئی واقعات اور قرآن مجید کے مضامین و مطالب سے استدلال کیا گیا ہے مثلاً

۱۴۴ یقولون لَقَوْلُهُ بَل لَّا يَوْمَنُونَ  
 یا یہ کہتے ہیں کہ (پینمبر) قرآن مجید خود بنا لائے  
 فلیاتوا بحديث مثله ان كانوا  
 ہیں (کوئی نہیں) بلکہ یہ لوگ ایمان نہیں لائے  
 صدقین (الطور)  
 ہیں۔ اب ان کو چاہئے کہ کوئی بات اسی طرح  
 کی لے آئیں اگر وہ سچے ہیں۔

حضرت یوسف کا واقعہ بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے۔

ذالك من انباء الغيب نوحيه  
 یہ غیب کی خبریں جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں اور  
 اليك وما كنت لدرهم اذ اجمعوا  
 آپ (اے محمد) ان کے پاس نہیں تھے جب  
 اخرهم وهم يكفرون  
 انھوں نے اپنی کوشش مرکز کر لی اور وہ  
 (یوسف) تمہیں کرنے لگے۔

حضرت مریم کے واقعہ کے ذکر کے بعد فرمایا گیا ہے۔

ذالك من انباء الغيب نوحيه  
 یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم آپ کے پاس وحی کرتے  
 اليك وما كنت لدرهم اذ يلقون  
 ہیں اور آپ ان لوگوں کے پاس نہیں تھے جب  
 افلا هم اثم بئس ما  
 وہ قرعہ اس غرض سے ڈال رہے تھے کہ مریم کی  
 كنت لدرهم اذ يلقون (مریم)  
 کفالت کون کرے گا اور آپ ان کے پاس نہیں تھے

اس آیت کو ذرا غور سے پڑھئے اور دیکھئے کہ اس میں دو مرتبہ "وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ" فرما کر اس بات پر زور ڈالا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بذات خود حضرت مریم کی کفالت پر بحث و تکرار کے وقت موجود نہیں تھے۔ تو اب قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر آپ کو اس واقعہ کا علم کس طرح ہوا؟ قرآن مجید اس کا جواب دیتا ہے کہ "نوحیہ الیک" ہم آپ پر اس کی وحی بھیجتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ کسی گذشتہ واقعہ کو معلوم کرنے کی وہی صورتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس کو کسی اخبار یا کتاب میں پڑھا ہو۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ کسی سے سُننے کا اتفاق ہوا ہو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک صورت بھی متحقق نہیں تھی۔ پہلی صورت کی تو آپ نے خود "لست بقادری" میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، "فراکرفی کردی" اور آپ کا بڑے سے بڑا مخالف بھی اس کی تردید نہیں کر سکا۔ اب رہی دوسری صورت یعنی یہ کہ آپ کو کسی نے یہ واقعات غیب سنائے ہوں تو قرآن مجید اس کی تردید اس طرح کرتا ہے۔ حضرت نوح کے قصہ کے بعد ارشاد ہے۔

تِلْكَ مِنْ آيَاتِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا  
إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا  
قَوْمَكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا فَاصْبِرْ إِنَّ  
الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ (ہود)

یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم آپ پر وحی کرتے ہیں، اس سے پہلے نہ آپ اس کو جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم، آپ صبر کیجئے! کوئی شبہ نہیں کہ عاقبت پر ہنرگاروں کے لئے ہی ہے۔

پس جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ان دونوں میں سے کوئی ایک ذریعہ علم بھی نہیں ہے۔ تو اب قرآن کا دعویٰ "نوحیہ الیک" کے تسلیم کرنے میں کیا تذبذب ہو سکتا ہے۔ حضرت موسیٰ کے واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْغَرْبِيِّ إِذْ قَضَيْنَا  
إِلَى مُوسَى الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ

اور (اے نبی) آپ طور کی جانب غربی میں نہیں تھے جب ہم نے موسیٰ کی طرف اپنا فیصلہ نازل

الشہدین (القصص) کیا اور آپ اس وقت وہاں موجود نہ تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا

وَلَكِنَّا أَنشَأْنَا قُرُونًا فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمْ

لیکن ہم نے بہت سی جماعتیں پیدا کیں اور ان

الْعُمُرُ وَمَا كُنْتَ ثَابِتًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ

پر دراز مدتیں گزر گئیں اور آپ مدین والوں

تَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا وَلَكِنَّا كُنَّا

میں نہ رہتے تھے کہ ان کو ہماری آیات سناتے

هَمز سِلِينَ (القصص) لیکن ہم رسول بھیجتے رہے ہیں۔

اس آیت کے بعد جو آیت ہے اس میں بھی اس مضمون کا اعادہ کیا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا

اور آپ طور کے کسی کنارہ پر نہیں تھے جب ہم

وَلَكِنْ رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكَ لَنُنَادِرَ

نے ندا دی، لیکن آپ کو یہ واقعہ محض اپنے رب کی

قَوْمًا مَّا آتَاهُم مِّنْ نَّبِيٍّ مِّن قَبْلِكَ

رحمت سے معلوم ہوا ہے تاکہ آپ اس قوم کو ڈرنا،

لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ

جس کے پاس آپ سے پہلے کوئی ڈرانے والا نہیں

آیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔

عرب کی گذشتہ قوموں کے حالات سننے کے بعد ارشادِ حق بنیاد ہے۔

تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ

یہ آبادیاں وہ ہیں جن کے کچھ حالات ہم آپ

أَنْبَاءِهَا

کو سناتے ہیں۔

سورہ غلکھوت کی آیت ذیل میں اسی مضمون کو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس انسانی

ذرائع علم میں سے کوئی ذریعہ نہیں تھا، اور آپ کا ذریعہ علم صرف وحی الہی تھا اور زیادہ واضح طور پر

بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوا مِنْ قَبْلِهِ مِنْ كِتَابٍ

نزدول قرآن سے پہلے نہ تو آپ کوئی کتاب

وَلَا تَحْطَئُ يَمِينِكَ إِذَا لَرْتَابِ  
 پڑھتے تھے اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتے  
 تھے، اگر ایسا ہوتا تو ان باطل پرستوں کے لئے  
 المیطلون

شہ کی گنجائش بھی نکلتی

اس آیت میں صراحتاً اس بات کا اعلان کر دیا گیا ہے کہ آپ نزولِ قرآن سے پہلے نہ کوئی کتاب پڑھ  
 سکتے تھے اور نہ لکھ سکتے تھے۔

ایک مقام پر ارشاد ہے۔

وَكُنَّا لَكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحًا  
 اور اس طرح ہم نے آپ کے پاس اپنے حکم و روح  
 مِنْ أَمْرِ نَا مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ  
 بھیجی۔ آپ جانتے ہی نہیں تھے کہ کتاب کیا ہے  
 وَلَا الْإِيمَانُ رَشَعًا  
 اور ایمان کیا ہے۔

اب ایک احتمال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ یہ غیبی اطلاعات آپ نے کسی سے سنی ہوں تو اس سلسلہ میں  
 یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کہ معظمہ میں دو قسم کے لوگ آباد تھے ایک مشرکین اور دوسرے اہل کتاب یعنی یہود  
 و نصاریٰ۔ مشرکین چونکہ کوئی کتاب نہیں رکھتے تھے اسلئے انکو انبیاء متقدمین کا کوئی واقعہ بھی معلوم نہیں  
 تھا، چنانچہ حضرت مریم کے قصہ میں "مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا قَوْمُكَ" فرما کر اسی امر کی طرف  
 توجہ دلائی گئی ہے۔ اب رہے کہ کے اہل کتاب یہود و نصاریٰ تو اس میں شہ نہیں کہ ان لوگوں کی  
 آسمانی کتابوں میں بعض انبیاء کے واقعات کا تذکرہ ضرور ہے لیکن سید کوئین کے بڑے بڑے  
 دشمن بھی جانتے تھے کہ آپ نبوت سے پہلے ان لوگوں سے الگ تھلک رہتے تھے۔ اور اس لئے  
 کوئی شخص ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں کر سکتا تھا کہ آپ کو ان غیبی قصص و واقعات کا علم یہود و  
 نصاریٰ کے ذریعہ ہوا ہے۔ دشمنوں نے آپ کی تکذیب میں کیا کچھ کہا۔ لیکن قرآن کے اوجار و نقیص  
 علیک "یا نوحیہ الیک" کے جواب میں یہ کہنے کی جہارت کسی ایک کو بھی نہیں ہوئی کہ آپ فلاں وقت

یا فلاں مقام پر کسی عیسائی یا یہودی سے قصہ سن رہے تھے۔ لے دے کے عیسائیوں کے پاس بھرا رہا ہے۔  
 کا ایک افسانہ ہے۔ جو اول تو ثابت نہیں۔ اور اگر ثابت مان بھی لیا جائے تو کیا دنیا کا کوئی معمولی  
 عقل کا انسان بھی اسے باور کر سکتا ہے کہ راہب نے چند منٹوں میں ہی آپ کو جبکہ آپ کی عمر بار  
 تیرہ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ اور آپ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ شام کے سفر پر جا رہے تھے  
 وہ سب کچھ تباہ یا جو قرآن مجید کے دو دو فٹون کے درمیان ہے۔ اور پھر آپ نے اس کو بغیر لکھے ہی  
 من وعین گوشہ حافظہ میں محفوظ کر لیا اور لطف یہ ہے کہ آپ شام سے واپس آتے ہیں۔ اور ان  
 کے بعد نبوت سے قبل تک، تائیں اٹھائیس سال مکہ میں رہتے ہیں اپنے قبیلہ کے لوگوں کیسے  
 اٹھتے بیٹھتے ہیں اور اس کے باوجود راہب کے سنائے ہوئے واقعات کو چل سا لگی کی عمر تک  
 بالکل حرفِ راز کی طرح سینہ میں پوشیدہ رکھتے ہیں۔ اشارۃً وکناۃً بھی کسی سے کسی واقعہ کا ذکر نہیں  
 اور چالیس سال کی عمر کے بعد یکایک غیبی اطلاعات کا سمت در اُمنڈ پڑتا ہے۔ یا للجب  
 بہر حال یہ احتمال چونکہ اس درجہ کمزور تھا کہ آپ کے دشمنوں کے حاشیہ خیال میں بھی موجود  
 نہیں تھا اس لئے قرآن مجید نے اس سے سکوت کیا۔

عدم اختلاف سے قرآن کے جزئی واقعات کے علاوہ قرآن مجید میں اختلاف کے نہ ہونے سے بھی  
 منزل من اللہ ہونے پر استدلال اُس کے منزل من اللہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

أَفَلَا يَتَذَكَّرُونَ الْقُرْآنَ ط و ل و کیا یہ لوگ قرآن میں تدبر نہیں کرتے، اور اگر  
 کان من عند غیر اللہ لوجہ دانیہ یہ اللہ کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو  
 اختلافاً کثیراً (نار) اس میں کثیر اختلاف پاتے۔

اہل کتاب قرآن کے منزل اہل کتاب اگرچہ زبان سے انکار کرتے تھے، لیکن دل میں وہ بھی جانتے  
 من اللہ ہونے سے باخبر ہیں تھے کہ قرآن مجید اللہ کی کتاب ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ

واہل کتاب تھے اور اس بنا پر کلام الہی اور وحی ربانی کے مفہوم سے یکسر بیگانہ نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب کی تسکین کے لئے اس کا بھی ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا بِالْكِتَابِ يَعْلَمُونَ اور وہ لوگ جنکو ہم نے کتاب دی ہو وہ جانتے

أَنَّهُ مُنْزَلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ ہیں کہ یہ قرآن آپ کے رب کی طرف سے حق

فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُسْتَوِينَ (بقرہ) کے ساتھ نازل ہوا ہے پس آپ شک کرنے والوں

ایک دوسری آیت میں ہے۔

وَيُرِي الَّذِينَ آذَوْا عَلِيْمًا اور وہ لوگ جنھیں علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں

الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكَ مِنَ رَبِّكَ کہ جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی جانب سے

هُوَ الْحَقُّ۔ (سبا) نازل کیا گیا ہے وہی حق ہے

ایک اہل کتاب کی شہادت کوئی ایسی اہم بات نہیں تھی۔

لیکن چونکہ اُس زمانہ میں عرب کے جاہل مشرکین بنو اسرائیل کے علم و فضل سے مرعوب تھے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن کے کتاب الہی ہونے کی تردید و تکذیب کیلئے

ان علماء کا سہارا ڈھونڈتے تھے جس میں ان کو ہمیشہ ناکامی اس بنا پر ہوتی تھی کہ خدا نے خود ان

علماء کی زبان سے آنحضرت کی رسالت اور قرآن کے وحی ہونے کی تصدیق کرادی تھی بلکہ ان میں

بعض علماء تو ایسے تھے جنھوں نے سرکارِ دو عالم کا روئے انور دیکھتے ہی سرطاعت و تسلیم خم

کر دیا اور بے ساختہ بول اُٹھے۔ "إِنَّ هَذَا الْوَجْهَ لَيْسَ بِوَجْهِ كَاذِبٍ" بے شبہ یہ چہرہ کوئی

کاذب چہرہ نہیں ہے۔" اس لئے ان منکرینِ وحی کو عار دلانے اور قرآن مجید کے وحی الہی ہونے

کی حقیقت کو ان پر بطور الزام ثابت کرنے کے لئے ایک عالم نبی اسرائیل (عبداللہ بن سلام)

کی شہادت کو بھی اہتمام کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

قُلْ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كَانِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ  
 وَكُفَرْتُمْ بِهِ وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِنْ  
 بَنِي إِسْرَائِيلَ عَلَى مِثْلِهِ فَأَمَّا  
 اسْتَكْبَرْتُمْ إِنْ كَانِ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ  
 الظالمين (الاحقاف) ظالموں کو ہدایت نہیں دیتا۔

سورہ بنی اسرائیل میں اسی مضمون کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

قُلْ آمِنُوا بِهِ أَوْ لَا تُمِنُوا إِنَّ  
 الَّذِينَ أُوذُوا بِالْعِلْمِ مِنْ قَبْلِهِ إِذْ  
 عَلَيْهِمْ يُخْرِذُونَ لِلَّذِينَ سَجَدُوا  
 يَقُولُونَ سُبْحَانَ رَبِّنَا إِنْ كَانِ وَعْدُ  
 رَبِّنَا لَمَفْعُولًا  
 آپ کہئے! تم ایمان لاؤ یا نہ لاؤ جن لوگوں کو قرآن  
 سے پہلے علم ملا ہے ان پر جب اس قرآن کی تلاوت  
 کی جاتی ہے تو وہ اپنی ٹھوڑیوں کے بل سجدہ میں  
 گر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں پاک ہے ہمارا رب اس  
 کا وعدہ ہو کر رہا۔

ایک آیت میں مشرکین سے پوچھا گیا ہے کہ کیا علماء بنی اسرائیل کا قرآن کی حقیقت سے آگاہ ہونا تمہارا  
 لئے خدا کی کوئی نشانی نہیں ہے؟

لے اس آیت کا مفاد بھی یہ تھا ہے کہ قرآن کی حقانیت اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی تصدیق وہ انصاف پسند  
 اور با علم کر رہے ہیں جنہیں کھلی کتابوں کی بیاناتوں سے واقفیت ہے۔ ”وعد اللہ سے اشارہ اس وعدہ ربانی کی  
 طرف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی بنی توراہ کتاب استثنائی میں اس طرح کیا گیا تھا۔ اسے بنی اسرائیل میں تمہارے  
 بھائیوں (بنی اسرائیل) میں سے ایک نبی اٹھاؤں گا جس کے منہ میں اپنا کلام ڈالوں گا، علماء اہل کتاب قرآن مجید  
 کو سن کر فوراً سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور وہ یقین کرتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم، وہی رسول بشر ہے اور  
 قرآن وہی کلام خداوندی ہے جس کا ذکر توراہ میں کیا گیا ہے۔“



اولم یکن لھم ایتۃ ان یعلّمہ علماء کیا ان کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ اس کو  
 بنی اسرائیل (الشعرا) علماء بنی اسرائیل جانتے ہیں  
 مشرکین وحی سے بیگانہ تھے لیکن جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اہل کتاب وحی اور کلام الہی کی حقیقت  
 کو اچھی طرح جانتے تھے۔ اور انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ خود ان کی آسمانی کتابوں کی پیش گوئیوں اور بشارتوں  
 کے مطابق بنو اسمعیل میں ایک نبی پیدا ہوگا اور اپنے ساتھ اللہ کی ایک کتاب بھی لائے گا۔ پس اگر یہ لوگ  
 بھی قرآن کو وحی ماننے سے انکار کریں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان نہ لائیں تو  
 ظاہر ہے ان سے بڑھ کر ظالم اور کون ہو سکتا ہے، چونکہ اسلام قبول کرنے کی توقع مشرکین کی بہ نسبت  
 ان لوگوں سے زیادہ تھی اس لئے خدا نے حکم دیا کہ مسلمانوں کا معاملہ اہل کتاب کے ساتھ نرمی کا ہونا  
 چاہئے۔ مسلمانوں کو ان سے کنا چاہئے کہ تم کو قرآن کے وحی ماننے میں کیا تامل ہے۔ آخر تم بھی تو  
 ہماری طرح ایک کتاب الہی پر ایمان رکھتے اور اُسے منزل من اللہ مانتے ہو۔ دیکھئے! کس بلیغ پیرا یہ ہیں  
 ارشاد ہوتا ہے۔

وَلَا تَجَادِلُوا أَهْلَ الْكِتَابِ إِلَّا  
 بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا  
 مِنْهُمْ وَقُولُوا آمَنَّا بِالَّذِي أُنزِلَ  
 إِلَيْنَا وَأُنزِلَ إِلَيْكُمْ وَالْحَمْدُ  
 لِلَّهِ وَاحِدٌ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ  
 وَكَذَلِكَ أَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ  
 فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ يُؤْمِنُونَ  
 بِهِ وَمِنْ هَؤُلَاءِ مَنْ يُؤْمِنُ بِهِ وَمَا

اور تم اہل کتاب سے صرف بطریق احسن مجادلہ  
 کرو ان میں سے ان لوگوں کے سوا جنہوں نے  
 (انکار حق کر کے) ظلم کیا ہے اور ان سے کہو کہ ہم  
 ایمان لے آئے ہیں اُس کتاب پر جو تم پر نازل کی  
 گئی اور اُس پر بھی جو ہم پر نازل کی گئی ہے اور ہمارا  
 اور تمہارا مجود ایک ہے اور ہم اُس کے مطیع و فرمان  
 بردار ہیں، اور اسی طرح ہم نے داسے تمہیں آپ پر  
 کتاب نازل کی۔ پس جن لوگوں کو ہم نے کتاب

يُحْجَدُ بِآيَاتِنَا إِلَّا الْكٰفِرُونَ  
 دے رکھی تھی اور اس پر ایمان لے گئے ہیں اور ان  
 اہل مکہ میں سے بھی بعض وہ ہیں جو اس کتاب پر  
 ایمان رکھتے ہیں ہماری آیات سے جو دودا نکارتو  
 کافر ہی کہتے ہیں۔

مشرکین کے اعتراضات کی تردید | پھر ان استدلال و ترغیبات پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ بعض درویش  
 دہن مشرکین و کفار قرآن کی اس حیثیت پر جو اعتراضات کرتے تھے۔ ان سب کے بھی جوابات دیئے گئے  
 ہیں۔ یہ لوگ کہتے تھے کہ اگر قرآن اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں نسخ نہ پایا جاتا۔ قرآن اس کا ذکر اس  
 طرح کرتا ہے۔

وَ اِذْ اَبَدْنَا لَنَا اٰیةً مَّكَانَ اٰیةٍ وَاللّٰهُ  
 اور جب ہم ایک آیت کی جگہ دوسری آیت رکھتے  
 اَعْلَمُ بِمَا يُنَزَّلُ قَالُوْا اِنَّمَا اَنْتَ مُفْتَرٍ  
 ہیں اور اللہ تعالیٰ جو کچھ نازل کرتا ہے وہ اسے  
 بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ  
 خوب جانتا ہے تو یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کلام  
 گھڑنے والے ہیں (نہیں) بلکہ ان میں سے اکثر جانتر  
 (النحل)

اور آنحضرت کو اس کے جواب میں یہ کہنے کا امر کیا جاتا ہے۔

قُلْ نَزَّلَهُ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّكَ  
 آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو میری رب کی طرف سے  
 رَبِّكَ بِالْحَقِّ لِيُنَبِّتَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا  
 روح القدس بیکرے ہے تاکہ جو لوگ ایمان لے آئے  
 وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى لِّلْمُسْلِمِيْنَ  
 ہیں ان کو ثابت قدمی حاصل ہو اور مسلمانوں  
 کے لئے ہدایت اور بشارت ہو۔  
 (النحل)

بعض کہتے تھے کہ حضور کا کوئی معلم ہے جو آپ کو یہ تمام باتیں سکھاتا ہے۔ اس قول میں یہ تہمان

طراز خود و دوقم کے لوگ تھے۔ کوئی کسی نصرانی غلام کو معلم بتاتا تھا۔ اور کوئی کسی یہودی غلام کا نام لیتا تھا۔ لیکن تھے یہ دونوں غلام عجمی۔ اگر مشرکین کا یہ معلم عربی ہوتا تو وہ متعین طور پر اس کا نام لے سکتے تھے۔ قرآن مجید میں کفار کی اس بہتان طرازی اور اس کی تردید کا بیان اس طرح ہے۔

وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكُمْ لِقَوْلِنَا  
يُعَلِّمُهُ بَشَرًا لِّسَانُ الَّذِي يُلْحِدُونَ  
إِلَيْهِ عَجْمِيٌّ وَهَذَا لِسَانٌ عَرَبِيٌّ  
مُبِينٌ (النحل)

اور ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مشرکین کہتے ہیں  
آپ کو ایک انسان قرآن سکھاتا ہے (حالانکہ جس  
شخص کی طرف یہ منسوب کرتے ہیں وہ عجمی ہے اور  
قرآن کی زبان صاف اور واضح عربی ہے

اس کے بعد ان لوگوں کے جھوٹ پر فہر تو شیعہ اس طرح ثبت کی گئی ہے۔

إِنَّمَا يَفْتَرِي الْكٰذِبُ الَّذِيْنَ لَا  
يُؤْمِنُوْنَ بِآيٰتِ اللّٰهِ وَآوٰلِيٰكِ  
هُمُ الْكَٰذِبُوْنَ (النحل)

یہ جھوٹ کا افتراء وہی لوگ کرتے ہیں جو اللہ کی  
کی آیات پر ایمان نہیں لاتے اور یہی وہ لوگ  
ہیں جو جھوٹے ہیں۔

بعض مشرکین کا خیال تھا کہ قرآن مجید کا القار شیاطین کی طرف سے ہوتا ہے اور عموماً

کاہن (Astrologer) غیب کی خبریں بیان کرتے ہی ہیں۔ آپ بھی کاہن ہیں اور اس لئے  
غیب کے واقعات بیان کرتے ہیں۔ قرآن مجید نے اس دوسرے شیطانی کی تردید بھی نہایت پُر زور  
الفاظ میں کی ہے ارشاد ہے۔

وَمَا تَنْزَّلَتْ بِهِ الشَّيْطٰنِ وَمَا يَنْبَغِيْ  
لَهُمْ وَمَا يَسْتَطِيعُوْنَ (الشُّعْرٰٓءِ)  
وَمَا هُوَ بِقَوْلِ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ  
فَاِنَّ تَذٰهَبُوْنَ (التكوير)

اس قرآن کو شیاطین نے نہیں اتارا اور نہ یہ  
اُن کے لائق ہے اور نہ وہ ایسا کر سکتے ہیں  
اور یہ قرآن مردود شیطان کا قول نہیں ہے  
پس تم لوگ کہاں جا رہے ہو۔

قرآن کو بعض لوگ شاعرانہ کلام کہتے تھے۔ اُس کی تردید کی گئی۔

وما نُكْوِلِقَوْلِ شَاعِرٍ قَلِيلًا مَّا تُوْمَنُونَ اور وہ (قرآن) کسی شاعر کا قول نہیں ہے۔ تم  
ولا يَقُولِ كَاهِنٍ قَلِيلًا مَّا تَدْكُرُونَ بہت ہی کم ایمان لاتے ہو۔ اور نہ وہ کسی کاہن  
(الحاکم) کا قول ہے۔ تم بہت کم نصیحت قبول کرتے ہو۔

ان سب اعتراضات اور شیطانی دساوس کی تردید کے بعد اللہ تعالیٰ خود اپنی اور فرشتوں  
کی شہادت سے قرآن کے منزل من اللہ ہونے کا ثبوت دیتا ہے۔

لَكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ لَكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ  
أَنْزَلَهُ عَلَيْكَ وَالْمَلَائِكَةُ لِيَشْهَدْنَ كَيْفَ أَنْزَلَهُ عَلَيْكَ لَكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ بِمَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ  
وَكُفَىٰ بِاللّٰهِ شَهِيدًا اور فرشتے بھی گواہ ہیں (اگرچہ) شہادت کیلئے  
(نساء)

تو اللہ ہی کافی ہے

مشرکین کا کوئی اور حیلہ کارگر نہیں ہوا تو انہوں نے یہی کہنا شروع کر دیا کہ بھلا یہ معجزہ ہی کیا ہوا  
نہی بھی عربی اور قرآن بھی عربی۔ اصل معجزہ تو جب ہوتا کہ عربی نبی پر عجمی قرآن نازل ہوتا۔ قرآن نے  
مشرکین کے اس قول کی رکاکت کا بھی اظہار کیا ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَجْمِيًّا لَقَالُوا

لَوْ لَا فَصَّلَتْ آيَاتُهُ طُأَرْجِيٌّ وَعَرَبِيٌّ اسکی آیات مفصل کیوں نہیں ہیں بھلا زبان عجمی اور

قُلْ هُوَ الَّذِي أَنْزَلَهُ مِنْ شَفَاءِ لَوْ كَرِهَ لَأَفْضَلُ لَوْ كَرِهَ لَأَفْضَلُ لَوْ كَرِهَ لَأَفْضَلُ

وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقُرْآنًا وَعَرَبِيًّا لَوْ كَرِهَ لَأَفْضَلُ لَوْ كَرِهَ لَأَفْضَلُ

وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ فِي آذَانِهِمْ وَقُرْآنًا وَعَرَبِيًّا لَوْ كَرِهَ لَأَفْضَلُ لَوْ كَرِهَ لَأَفْضَلُ

يُنَادُونَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيدٍ (تم البعد) یہ قرآن ان کے حق میں اندھا پن ہے۔ یہ یہی وہ

اسکی آیات مفصل کیوں نہیں ہیں بھلا زبان عجمی اور

بعض کفار خود اپنا منہ چڑانے کے لئے کہتے تھے کہ قرآن (معاذ اللہ) من گھڑت ہے اور دوسرے لوگوں نے اس میں آپ کی مدد کی ہے۔ قرآن اس کی بھی تردید کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

قال الذین کفروا ان هذا الا  
آفک افترألا واعانہ علیہ قوم  
آخرون فقد جاؤا ظلماً و ذوراً  
(الفرقان)

کافر کہتے ہیں کہ یہ قرآن تو کچھ بھی نہیں براہمتان  
ہے اور اس کے بنانے میں دوسرے لوگوں  
نے مدد کی ہے کوئی شبہ نہیں کہ ان لوگوں نے،  
بالکل جھوٹ اور ظلم کی بات کہی ہے۔

اوپر جو آیات گزریں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جن میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کے وحی ربانی ہونے کے دلائل بیان کئے ہیں اور دوسری وہ آیات ہیں جن میں قرآن مجید سے متعلق کفار و مشرکین کے بیہودہ خیالات، باطل توہمات اور شیطانی وساوس کی پُر زور تردید کی گئی ہے۔ ان آیات کے علاوہ کثرت سے ایسی آیات بھی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ نے بالکل صاف اور واضح الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ قرآن مجید کا نزول اللہ کی جانب سے ہوا ہے۔ اس مضمون کے بار بار تکرار سے نشا یہ ہی ہے کہ اسلامی عقائد و اعمال کا یہ اساسی عقیدہ اس طرح لوگوں کے دل و دماغ میں راسخ ہو جائے کہ انھیں اس بارہ میں ذرا سا بھی تذبذب اور شک باقی نہ رہے۔ آیات ذیل ملاحظہ کیجئے

(۱) اِنَّا انزلنہ فی لیلۃ مبارکۃ

(دوغان)

ہم نے بے شبہ اس قرآن کو مبارک رات میں اتارا

بے شبہ ہم نے اس کو شب قدر میں نازل کیا

(۲) اِنَّا انزلنہ فی لیلۃ القدر (قدر)

اس قرآن کا نزول اُس ذات کی طرف سے

(۳) تنزیلاً مِمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ

ہے جس نے زمین اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا

العلیٰ (طا)

آپ کہہ دیجئے کہ اس قرآن کو اُس ذات نے نازل کیا

(۴) قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِیْ یَعْلَمُ السِّرَّ فِی

کیا ہے جو آسمانوں اور زمین کے بھیدوں سے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الفرقان)

(۵) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْآنَ تَنْزِیْلًا یعنی ہی قرآن مجید آپ پر ٹھہر کر نازل کیا ہے،

(۶) اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَآءِ نَحْنُ نَحْفَظُوْنَ یعنی ہی اس نصیحت (قرآن) کو اُتارا ہے اور ہم

نہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔

پورے قرآن کو اول سے آخر تک پڑھئے تو اس مضمون کی آیات چند ایک نہیں بلکہ بہت زیادہ ملیں گی۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید نے اپنے وحی ہونے کے مضمون کو جس شد و مد اور تاکید و تکرار سے بیان کیا ہے دنیا کی کسی اور کتاب سا وہی نے اپنے متعلق اس طرح بیان نہیں کیا۔ اس سلسلہ کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو ششہ تکمیل رہ گیا ہو۔

حضرت جبریل کی توثیق یہ ظاہر ہے کہ وحی اللہ کی طرف سے انبیاء پر عموماً حضرت جبریل کے واسطے سے نازل ہوتی رہی ہے اور خود قرآن بھی آنحضرت پر اسی طرح نازل ہوا، اس بنا پر قرآن میں حضرت جبریل کی وساطت کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور ان کی توثیق کر کے اس شبہ کو دور کر دیا گیا ہے کہ ممکن ہے ان سے پیغام الہی کے پہنچانے میں کوئی تغیر و تبدل ہو گیا ہو۔ ارشاد ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلْجَبْرِیْلِ فَاِنَّہٗ

نَزَّلَہٗ عَلٰی قَلْبِکَ بِاِذْنِ اللّٰہِ

(البقرۃ) آپ کہہ دیجئے کہ جو لوگ جبریل کے دشمن ہیں (ہو کریں) انہوں نے ہی تمہارے حکم سے آپ پر قرآن اُتارا ہے۔

سورہ نحل میں ہے۔

قُلْ نَزَّلَہٗ رُوْحُ الْقُدُسِ مِنْ رَبِّکَ

بِالْحَقِّ لَیْسَتِ الدِّیْنِ اٰمَنُوْا وَاُوْحِدِیْ

وَلِبَشَرِیْ لِّلْمُسْلِمِیْنَ ۝

ایمان والوں کو ثابت قدم رکھے اور وہ مسلمانوں کے لئے ہدایت اور بشارت ہو۔

سورہ شعرا میں انھیں روح الامین کہا گیا ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جبریل  
امین کامل ہیں۔ ان سے کسی خیانت یا کوتاہی کا اندیشہ نہیں ہو سکتا۔ فرمایا گیا ہے۔

نَزَّلَ بِهِ الرُّوحَ الْأَمِينُ عَلَى قَلْبِكَ  
لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ

قلب پر آرا ہے تاکہ آپ انداز کرنے والوں

میں سے ہو جائیں۔

(الشعراء)

سورہ تکویر میں اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ حضرت جبریل کی توثیق کی گئی ہے۔ ارشاد ہے

إِنَّهُ لَقَوْلُ رَسُولٍ كَرِيمٍ ذِي قُوَّةٍ  
عِنْدَ ذِي الْعَرْشِ مَكِينٍ مُطَاعٍ ثَمَرًا  
أَمِينٍ

بیشک وہ معزز قاصد کا کلام ہے جو قوت والا ہے

خدائے عرش کے نزدیک مرتبہ والا ہے۔ اس کی

اطاعت کی جاتی ہے اور وہاں امین معتبر ہے

سورہ النجم میں ہے۔

عَلَّمَهُ شَدِيدُ الْقُوَى ذُو مِرَّةٍ

آنحضرت کو سخت قوتوں والے اور زور آور

فاسطوی نے سکھایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق | حضرت جبریل کے تعارف اور ان کی توثیق کے بعد ضرورت تھی کہ  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی توثیق کی جاتی تاکہ کسی شخص کو یہ شبہ نہ ہو کہ ممکن ہے آپ سے وحی  
کے پہنچانے میں کوئی کوتاہی ہو گئی ہو۔ ساتھ ہی ضروری تھا کہ اس معاملہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم  
کی صحیح حیثیت بھی بیان کر دی جاتی جس سے یہ معلوم ہو جاتا کہ حضور تو محض ایک پیغمبر ہیں۔ اللہ کی  
طرف سے آپ پر جو وحی نازل ہوتی ہے آپ اس کو بے کم و کاست خدا کے بندوں تک پہنچانے  
پر مامور ہیں۔ پھر چونکہ اس منصب جلیل و عظیم در رسالت کے لئے خدا نے آپ کا انتخاب کیا ہے۔ اس  
لئے آپ کے ذہنی اور دماغی قومی بھی عام انسانوں سے زیادہ بلند اور مضبوط ہیں جس کے باعث

بیشک یہ ایک معجزہ و نشان کا قائل ہے جو اللہ کے بندوں کو  
کے نزدیک قوت والا ہے اور کسی اطاعت والا ہے اور اس کی

آپ وحی میں نہ کوئی تغیر و تبدل کر سکتے ہیں اور نہ اُس کے کسی لفظ اور معنی کا مفہوم سمجھنے میں آپ سے غلطی ہو سکتی ہے۔ رب الوحی نے یہ سب باتیں بھی قرآن میں بیان کی ہیں تاکہ لوگوں پر حجت تمام ہو جائے قرآن کا افسر کیا ہی نہیں جاسکتا اس سلسلہ میں بعض آیات تو وہ ہیں جن میں عمومی طور پر فرمایا گیا ہے کہ یہ قرآن سوائے اللہ کے کسی اور کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس عموم کے ماتحت خود سرور کائنات کی ذاتِ ستودہ صفات بھی داخل ہے۔ مثلاً یہ آیت۔

وَمَا كَانَ هَذَا الْقُرْآنُ أَنْ يُفْتَرَىٰ  
 مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ تَصْدِيقٌ  
 الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلٌ لِّمَا  
 لَدَارِبِ فِيهِ مِنْ رَبِّ الْعَالَمِينَ  
 اور یہ قرآن وہ نہیں ہو کہ اسکو غیر خدا نے گھڑ لیا  
 ہو۔ لیکن اُس کتاب کی تصدیق ہے جو اس سے پہلے  
 نازل ہوئی اور اُسکی ہی تفصیل ہے اس قرآن کے  
 رب العالمین کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ نہیں

آنحضرت صلعم کے متعلق قرآنی تصریحات ان کے علاوہ دوسری آیات وہ ہیں جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق چند تصریحات توضیحات ہیں ہم ذیل میں انہیں نمبر وار لکھتے ہیں

(۱) ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ آپ بھی اور انسانوں کی طرح ایک انسان ہیں فرق صرف یہ ہے کہ آپ پر وحی اترتی ہے۔

قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ

آپ نے ایسے میں تمہاری طرح ایک بشر ہوں البتہ مجھ پر وحی آتی ہے،

اور آج یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، آپ سے پہلے بھی انبیاء آتے رہے اور ان پر بھی وحی نازل ہوئی رہی ہے۔ بس آپ کا فرض منصبی یہی ہے کہ خدا کا پیام جوں کا توں لوگوں تک پہنچا دیں اس کے واسطے آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ خود آپ کے اور دوسرے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ "قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِنْ الرُّسُلِ وَمَا أَدْرِي مَا يُفْعَلُ بِي وَلَا بِكُمْ" آپ خود وحی کا اتباع کرتے ہیں اور آپ تو صرف صاف صاف ڈرانے والے ہیں۔ اسی آیت کے آخر میں ہے۔



إِنْ أَتَيْتُمْ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيْنَا وَإِنَّا لَآ نَذِيرٌ مُّبِينٌ

(۲) حضور کو لوگوں کے ثواب و عقاب میں بھی کوئی دخل نہیں ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبُهُمْ وَإِنَّ فِي ذَلِكَ لَآيَاتٍ لِّمَنْ يَعْقِلُ

ان کو توبہ کی توفیق عطا فرمائے یا انکو عذاب

(نار) دے وہ تو بہر حال ظالم ہیں۔

(۳) حضور کو اس کا بھی علم نہیں ہے کہ خدا نے لوگوں سے جس چیز کا وعدہ کیا ہے وہ قریب ہے

یا بعید ہے۔ فرماتے ہیں۔

قُلْ إِنْ أَدْرَىٰ أَقْرَبُ مَا وَعَدَنِي

آپ کہہ دیجئے، میں نہیں جانتا کہ تم سے جس چیز

کا وعدہ کیا گیا ہے وہ قریب ہے یا نہیں یا

میرا رب اس کے لئے کوئی مدت مقرر کرے گا؟

بعض مشرکین کہہ آئے تھے کہ آپ کی عام ہند و نصاح تو بڑی عمدہ ہیں۔ لیکن قرآن میں بت پرستی کی جو مذمت کی جاتی ہے اس سے تکلیف ہوتی ہو۔ اس لئے آپ یا تو موجودہ قرآن کو چھوڑ کر کوئی دوسرا قرآن لے آئیے جس میں ایسی ”دعوات“ باتیں نہ ہوں یا پھر کچھ اور نہیں تو اس قرآن میں ہی ترمیم اور تغیر و تبدل کر دیجئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

قَالَ الَّذِينَ لَا يُرْجُونَ لِقَاءَنَا

جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں ہے یعنی

أَنْتَ بَصِيرٌ أَنْ عَلَّمَهُمْ مَا لَا يُؤْمِنُونَ

حشر کا عقیدہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ آپ اس

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ

قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لے آئیے یا

مَنْ تَلْقَانِي فَنَسِيَّ إِنِّي أَخَافُ

اس کو ہی بدل دیجئے۔ آپ فرما دیجئے کہ میں

قرآن کو اپنی طرف سے بدل نہیں سکتا۔ میں تو

عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ اسی چیز کی پیروی کر دنگا جسکی وحی مجھ کو بھی گئی

- (یونس) ہے۔ اگر میں نے نافرمانی خداوندی کی تو میں اپنے

رب کے سخت دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔

(۴) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وحی کو بعینہ پونچا دیتے ہیں اور اس میں ہوا وہوس کا بالکل

دخل نہیں ہوتا۔ اعلان واجب الاذعان ہے۔

وما ينطق عن الهوى ان هو الا

وحی یوحی (الختم) وحی جس کی آپ پر وحی ہوتی ہے۔

(۵) اور آپ نطق عن الهوى کر بھی نہیں سکتے۔

ولو نقول علينا بعض الاقوال

لاخذنا منه باليمين ثم لقطعنا

منها الوتين فما منكم من احد

عندها جزين (الثاقم) اس کا روکنے والا نہ ہوتا۔

ایک اور مقام پر ارشاد ہے۔

ام يقولون انترى على الله

كذبا فان يشاء الله يختم على قلبك

ويختم الله الباطل ويختم الحق

بكلية انه عليم بذات الصدور

(شوری) سے خوب واقف ہے۔

(۶) کوئی شبہ نہیں کہ آپ دیانتدار اور سچے قاصد میں اللہ کی وحی بعینہ لوگوں تک پونچا دیتی ہے

اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ (المجادہ) کوئی شبہ نہیں کہ قرآن رسول کریم کا قول ہے۔  
 (۱۶) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھانا اور اُس کو آپ کے سینہ اقدس و اطہر میں محفوظ رکھنا یہ سب اللہ کے ذمہ ہے۔ اس بنا پر آپ سے اُس کے یاد کرنے اور سمجھنے میں نہ کوئی غلطی ہو سکتی ہے۔ اور نہ آپ کو اس میں کوئی سہو پیش آ سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید کونین فداہ ابی وومی اس خیال سے کہ کہیں وحی الہی کا کوئی لفظ گوشہ یاوسے اوجھل نہ ہو جائے نزول وحی کے وقت اپنی زبان حق ترجمان کو جلدی جلدی حرکت دیتے تھے، تو خدا نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا ارشاد ہے۔

اِنَّہٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ

لَا تَحْرِيْكَ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَجْعَلَ بِهٖ اَنْتَ عَلَيْنَا جَمْعًا وَقُرْاٰنًا فَاِذَا قُرْاٰنًا فَاتَمَّ قُرْاٰنًا  
 آپ جلدی جلدی پڑھنے کے لئے اپنی زبان کو حرکت نہ دیکھے قرآن کا آپ کے سینہ میں جمع کرنا اور اُس کا پڑھنا تو ہمارا ذمہ ہے۔ جب ہم

لے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے سورہ تکویر میں رسول کریم سے مراد جبریل ہیں لیکن سورہ المجادہ میں رسول کریم سے مراد آنحضرت ہیں۔ دونوں سورتوں میں رسول کریم کی جو صفات بیان کی گئی ہیں ان سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ آنحضرت اور جبریل دونوں کو رسول اس لئے کہا گیا ہے کہ جبریل اللہ اور آنحضرت صلعم کے اور سرور دو عالم اللہ اور اُس کے بندوں کے درمیان نامہ بری رسالت کا فرض انجام دیتے ہیں اور چونکہ دونوں اپنے اپنے فریضہ منصبی کے ادا کرنے میں نہایت دیانتدار اور امین ہیں۔ اس لئے دونوں رسول کریم ہیں۔ کسی شخص کو قول کے لفظ سے اشتباہ نہ ہونا چاہئے کہ اُس کی اضافت رسول کی طرف ہے۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ قاصد کا قول اگرچہ اُس کی زبان سے ادا ہوتا ہے اور اس لئے اُس کا قول (مجازاً) کہلاتا ہے۔ لیکن دراصل وہ ہوتا ہی کلام اُس شخص کا جس کا نامہ بر یہ قاصد ہوتا ہے۔

لے کو چہاں باطن اگر آفتاب حقیقت کی ایک ہلکی سی کرن بھی دیکھ سکیں تو انہیں معلوم ہو گا کہ قرآن مجید کے وحی الہی ہونے کے تمام دلائل ایک طرف اور صرف لَا تَحْرِيْكَ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَجْعَلَ بِهٖ اَنْتَ عَلَيْنَا جَمْعًا یہ مختصری آیت اس بات کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ قرآن حضور کا اپنا کلام نہیں، کون نہیں جانتا کہ کوئی منکلم کلام کرتے وقت اپنی زبان کو اس لئے جلد جلد حرکت نہیں دیتا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُسے یاد رہ جائے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

ایک آیت میں ہے۔

سُنْقِرِيكَ فَلَا تَنْسِيهِ إِلَّا مَا شَاءَ ۗ هُمْ أَكْبَرُ بِطُرُهَايِمِ كَيْ يَطْرُقَ بِرَبِّهِمْ لَيْسَ بِشَيْءٍ  
اللَّهُ إِنَّهُ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفَى ۗ وَهِيَ كَلِمَةٌ كَلِمَةٌ وَهِيَ كَلِمَةٌ كَلِمَةٌ  
وَيَسِّرْكَ لِلْيُسْرَىٰ ۗ كَوْنًا هِيَ أَدْرَمٌ أَدْرَمٌ أَدْرَمٌ أَدْرَمٌ أَدْرَمٌ أَدْرَمٌ أَدْرَمٌ أَدْرَمٌ  
(الاعلى) تک پہنچائیں گے۔

(۸) صرف پڑھانا اور یاد کرنا ہی نہیں بلکہ اُس کی تشریح و توضیح بھی اللہ ہی کے ذمہ ہے  
ثُمَّ إِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهُ (القصہ) پھر اُس کو سمجھانا بھی ہمارے ہی ذمہ ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بسلسلہ وحی جتنے امور بحث طلب ہو سکتے تھے  
دیکھو قرآن کے کس طرح ان میں سے ایک ایک امر کے بارہ میں واضح تفسیر کات کی ہیں۔  
قرآن آپ کے قلب پر نازل ہوا | ساتھ ہی اُس نے نزول قرآن کی کیفیت بھی بیان کی ہے کہ اُس کا تعلق  
جو اس ظاہری سے نہیں بلکہ دل سے ہے۔ ارشاد ہے۔

فَأَنزَلْنَا نَزْلًا عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ جَرَّلْنَا فِي قُرْآنِ كَرِيمٍ كَرِيمٍ كَرِيمٍ كَرِيمٍ كَرِيمٍ  
ایک اور مقام پر ہے۔

نَزَّلَ بِهِ الرُّوحَ الْأَمِينِ عَلَىٰ قَلْبِكَ ۗ قُرْآنَ كَرِيمٍ كَرِيمٍ كَرِيمٍ كَرِيمٍ كَرِيمٍ  
لتكون من المندرين ۗ ہوسے ہیں تاکہ آپ ڈرائیو والوں میں سے ہوں

روح محفوظ کا بیان | ساتھ ہی یہ بھی بتایا گیا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مطہر  
پر نازل ہونے سے پہلے روح محفوظ میں موجود تھا۔ ارشاد ہے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یقینی بات ہے کہ حضور پر مبارک فیاض کی جانب سے قرآن مجید کا فیضان ہو رہا تھا اور آپ ہر تقاضا  
بشریت اُسے یاد کرنے کیلئے اپنی زبان کو جلد بجز حرکت سے رہے تھے اس پر حضرت حنیبل مجدہ نے یہ آیت نازل فرمائی

بل هو قرآن مجید فی لوح محفوظ (البروج)  
بلکہ قرآن مجید ہے جو لوح محفوظ میں ہے۔  
اور صرف قرآن مجید میں نہیں بلکہ دنیا کے تمام واقعات و اشیاء کا تذکرہ اس میں موجود اور ثبت ہے۔ فرمایا گیا ہے۔

كُلُّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ  
ہم نے تمام باتوں کو ایک واضح کتاب میں  
جمع کر دیا ہے۔ (یس)

ایک آیت میں لوح محفوظ کو "کتاب مبین" کہا گیا ہے اور اس میں بھی اس کی اسی صفت کا بیان ہے۔

وَعِنْدَ لَا مَفَاحِ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا  
اور اللہ کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جن کو صرف  
هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبُرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا  
اللہ ہی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے ان  
تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا  
چیزوں کو جو خشکی میں اور سمندر میں ہیں اور جو پتہ  
حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ  
گرتا ہے اور زمین کی تاریکیوں میں جو دانہ گرتا  
وَلَا يَالِسِ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ  
ہے اللہ تعالیٰ ہی اس کو جانتا ہے اور کوئی  
تَرٍ وَلَا رَطْبٌ وَلَا يَالِسُ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُّبِينٍ  
تر اور کوئی خشک چیز ایسی نہیں ہے جو کھلی  
(انعام)  
ہوئی اور واضح کتاب میں نہ ہو۔

سورہ حدید میں ارشاد ہوتا ہے۔

مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ  
لَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ  
قبل ان نبراءها ان ذالک  
عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ  
لک میں یا خود تمہارے اندر جو مصائب نازل  
ہوئے ہیں ان میں کوئی مصیبت ایسی نہیں  
ہے جو اس کو پیدا کرنے سے پہلے لوح محفوظ  
میں محفوظ نہ ہو۔ یہ بے شبہ اللہ کے لئے آسان ہے

سورۃ النمر میں اُس کا بیان اس طرح ہے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ فَخْلُوهُ فِي الزَّبَدِ وَكُلُّ  
اور ہر وہ چیز جو انھوں نے کی لکھی ہوئی ہو درتوں

صغیر و کبیر مُسْتَطَرٌّ  
میں اور ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی جا چکی

ان آیات کی روشنی میں قرآن مجید سے لوح محفوظ کی نسبت صرف اتنی بات ثابت ہوتی ہے

کہ وہ کوئی ایسی چیز ہے جس میں بد و آفرینش سے انتہا تک کے تمام حالات و واقعات۔ ادا مرد و نواہی،

اور نواز و اسرار لکھے ہوئے ہیں اور ان کے ساتھ قرآن بھی اُس میں لکھا ہوا ہے۔ اس سلسلہ میں اتنی

بات کا اور اضافہ کیا جاسکتا ہے کہ قرآن میں آلات کتابت و تحریر میں سے قلم کا بھی ذکر ہوا ہے اور

ن وَالْقَلَمِ وَمَا يَسْطُرُونَ  
ن، قلم ہو قلم کی اور اُس کی جس سے لکھتے ہیں

لیکن اس لوح کی شکل و صورت کیسی ہے؟ اور اُس کی حقیقت کیا ہے؟ قرآن نے حسب دستور

عرش و کرسی کی طرح اس کی بھی کوئی حقیقت بیان نہیں کی۔ البتہ بعض کتب احادیث میں اس کے

متعلق حضرت ابن عباس کا ایک اثر ملتا ہے لیکن اُس سے بھی کوئی حقیقت متعین نہیں ہوتی بعض

لوگوں نے کہا ہے کہ لوح محفوظ ایک جوہر مجرد ہے کسی چیز میں نہیں اور وہ صور علیہ کے لئے بمنزلہ آئینہ

کے ہے لیکن کتاب و سنت کے ظواہر الفاظ سے اس کی بنیاد نہیں ہوتی۔ بہ بطور تمثیل یہ کہا

جاسکتا ہے کہ جس طرح حافظ قرآن کے دماغ میں قرآن مجید کے کلمات ثبت ہوتے ہیں۔ لیکن وہ اس

میں منقوش و مکتوب نہیں ہوتے۔ اسی طرح لوح محفوظ میں تمام عالم کے مقادیر ثبت ہیں لیکن عام الواح

دنیا پر قیاس کر کے ان کے متعلق یہ کہنا صحیح نہیں کہ اُس میں مقادیر منقوش ہیں۔ واللہ اعلم

قرآن کو کلام اللہ بھی کہا گیا ہے | پھر قرآن مجید کو صرف وحی کہنے پر ہی اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ اس حوالہ

لفظوں میں کلام اللہ بھی کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَرِءَانِ أَحَدًا مِّنَ الْمُشْرِكِينَ اسْتَجَارَكَ  
اور اگر کوئی مشرک آپ سے امن طلب کرے تو

فَاجِدْهُ حَتَّىٰ تَسْمَعَ كَلَامَ اللَّهِ  
 آپ اُسکو امن دیدیکے یہاں تک کہ وہ اللہ  
 کا کلام سُنے۔

قرآن بشر کہنے پر عذاب | اب چونکہ حضرت جبریل اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توثیق کر کے  
 دوزخ کی وعید | قرآن کے وحی اور منزل من اللہ ہونیکے ثبوت میں اللہ کی طرف سے حجت  
 تمام ہو چکی ہے۔ اس لئے اب کسی منکر کا عذر لائق پذیرائی نہیں ہو سکتا۔ اور جو شخص اب بھی  
 قرآن کو کلام بشر یا جادو کہتا ہے وہ بے شبہ دوزخ کے عذاب کا سزاوار ہے۔ ایک  
 مرتبہ ولید بن مغیرہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے قرآن پڑھ  
 کر سنایا وہ کسی قدر اُس سے متاثر ہوا۔ مگر ابوجہل اور دوسرے سرداران قریش نے اُس کو  
 درغلایا۔ اور پوچھا "قرآن کے متعلق تمہاری کیا رائے ہے؟" کہنے لگا "ذرا سوچ لوں" آخر پورا  
 بدل کر اور منہ بنا کر بولا "یہ تو بابل کا جادو ہے جو نقل ہوتا چلا آتا ہے" اور "یہ تو انسان کا قول ہے"  
 اس پر قرآن مجید میں آیت ذیل اتری جس میں عذاب دوزخ کی وعید کی گئی ہے۔

أَنَّهُ فَلَکَرَفَقِيلَ کَیْفَ قَدَّرَ  
 اُس نے سوچا اور دل میں ایک بات ٹھہرائی، وہ  
 ثُمَّ قُلَ کَیْفَ قَدَّرْتُمْ نَظَرْتُمْ  
 مارا ہی جاسے اُس نے دل میں کیا بات ٹھہرائی  
 عَبَسَ وَبَسَّ ثُمَّ أَذْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ  
 ٹھی۔ پھر وہ مارا ہی جاسے اُس نے کیا ٹھہرایا تھا  
 فَقَالَ إِنَّ هَذَا إِلَّا سِحْرٌ یُّؤْتِیْهِ  
 پھر اُس نے دیکھا۔ تو رمی چڑھائی اور منہ پھلایا  
 إِنَّ هَذَا إِلَّا قَوْلُ الْبَشَرِ  
 پھر شپٹ پھیر لی اور غرور کیا اور کہنے لگا "یہ  
 تو جادو ہے جو منقول ہو کر آتا ہے۔ یہ تو قول  
 بشر ہی ہے۔

یہاں تک تو ولید بن مغیرہ کا مقولہ اور اُس کے احوال و کوائف کا بیان تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ

فرماتا ہے۔

سَأَصْلِيهٖ سَقَرٌ وَمَا ادْرَاكُ مَا  
 سَقَرٌ لَا تَبْقَى وَلَا تَذَرُ لَوْ اَشَاءَ يَلْبَسُوْهُ  
 (المذثر)

اور نہ چھوڑتی ہی وہ آدمی کو بچھلے دینے والی ہے

قرآن مع عربی الفاظ کے وحی الہی ہے | اب صرف ایک مسئلہ باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ کہ قرآن جس کو اللہ

کا کلام کہا گیا ہے۔ وہ صرف معانی و مطالب کے لحاظ سے ہے۔ یا عربی الفاظ اور ان کی مخصوص شے

و ترکیب کے لحاظ سے بھی۔ آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ یہ لفظ و معنی کی تفریق خاص عہد نبوت میں ان

لوگوں نے بھی نہیں کی جو رسول صادق و امین کی تلمذ کیلئے ایک ایک تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے

وہ خود ارباب لسان تھے۔ زبان کی فصاحت و بلاغت اور اسالیب بیان کی مہارت میں یگانہ روز

گارتھے۔ اس کے باوجود قرآنی الفاظ کے اعجاز نے انہیں اس درجہ متاثر کر دیا تھا کہ وہ پورے قرآن کو

تو مع اس کے الفاظ و معانی کے "ساحرانہ" "کاهنانہ" یا "شاعرانہ" کلام کہتے تھے۔ لیکن یہ کہنوی کہمت

انہیں بھی نہیں ہوئی کہ "مجدد صلعم" کے الفاظ میں ایسی کونسی الہی خصوصیت ہے کہ وہ انہیں بھی اللہ کا

کلام نازل کیا ہوا کہتے ہیں۔ ایسے جملے اور ایسی عبارتیں تو ہم بھی بول اور لکھ سکتے ہیں۔

لیکن خدائے غلام الغیوب کو علم تھا کہ اب نہیں تو بعد میں تفلت اور عقلیت پرستی کے دور میں

ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو ایک طرف اپنے مسلمان ہونے کا ادعا کریں گے اور دوسری طرف اپنے

تفلت کا بھرم قائم رکھنے کے لئے قرآن کو معانی و مطالب کے لحاظ سے تو وحی خداوندی تسلیم کریں گے

لیکن اس کے الفاظ کی نسبت خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کرنے میں متامل نہیں ہوں گے

اس بنا پر قرآن مجید نے اس مسئلہ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا۔ اور اس کی بھی تصریح کر دی کہ قرآن مع

الفاظ عربی کے اللہ کا کلام ہے اور اللہ کی طرف سے وحی کا نزول انہیں عربی الفاظ میں ہوا ہے



ارشاد ہے۔

قرآننا غیر ذی عوج قرآن عربی بغیر کسی کجی کے

علاوہ ازیں آیات ذیل غور سے پڑھئے۔

إِنَّا أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا

ہم نے قرآن عربی نازل کیا ہے

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَعَلَّكُمْ

بے شبہ ہم نے اس کو عربی قرآن بنا یا ہے

تاکہ تم سمجھو۔

تَعْقِلُونَ

وَكذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا

اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی بنا کر اتارا ہے

وَكذَٰلِكَ أَنْزَلْنَاهُ حِكْمًا عَرَبِيًّا

اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی بنا کر اتارا ہے

دیکھئے! ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مطلق قرآن کے نزول کی نسبت اپنی طرف نہیں کی بلکہ

اس قرآن کی نسبت اپنی طرف کی ہے جو عربی زبان میں ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہونا بھی یہی چاہئے

تھا کیونکہ محض معانی و مطالب کے اتنا رد و ایجاز کے کوئی معنی ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ جس طرح معانی کا

زبان سے اظہار بغیر الفاظ کے نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح معانی کا دل میں نمود اور ان کا تعین بھی الفاظ کے

بغیر ناممکن ہے۔

تقسیمات و نتائج | اب ان سب آیات کو سامنے رکھ کر غور کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح قرآن مجید

کی نسبت ایک ایک بات کو کھول کر بیان کیا ہے اور جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ اس میں رمز بھی ہے

کہ لوگوں کو قرآن مجید کے وحی الہی ہونے میں کوئی شک اور تردد نہ رہے۔ یہی مسئلہ دین کی اساس

اور بنیاد ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا۔ ان تمام آیات سے حسب

ذیل نتائج ثابت ہوتے ہیں۔

(۱) قرآن مجید اللہ کا کلام ہے۔ اور مع الفاظ و معانی کے۔

(۲) حضرت جبریل اُسے لیکر نازل ہوئے ہیں۔

(۳) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ نازل ہوا ہے۔

(۴) جبریل اور آنحضرت دونوں بے انتہا امین اور دیانتدار ہیں۔

(۵) آنحضرت نے یا کسی اور شخص نے اُس کو بنایا نہیں ہے۔

(۶) شیاطین نے اُس کا انکار نہیں کیا۔

(۷) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم رسول کریم تھے۔ قرآن آپ پر جیسا نازل ہوتا تھا ویسا ہی لوگوں

تک پہنچا دیتے تھے۔ آپ کو اس میں نہ نیاں ہو سکتا تھا اور نہ کوئی مخالفت۔

(۸) آپ شاعر، کاہن، یا ساحران میں سے کچھ نہ تھے۔

(۹) قرآن کے منزل من اللہ ہونے کے دلائل قاطع کا بیان

(۱۰) اس پر کفار و مشرکین کے اعتراضات و وساوس کا حتمی رد۔

(۱۱) عام انسانوں تک اللہ کے اس کلام کے پہنچنے کا ذریعہ صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

ذات گرامی ہے۔ اور آپ چونکہ ہر طرح اللہ کے معتمد اور اُس کے پتھے رسول ہیں اس لئے جو کلام آپ

کی وساطت سے پہنچا ہے اور خود آنحضرت نے بھی اسے خدا کا کلام کہا ہے، ہر انسان کا فرض ہے

کہ بے چون و چرا اسے قبول کر لے اور اس کے کلام اللہ ہونے پر ایمان لے آئے۔

مندرجہ بالا نتائج قرآن مجید کے اشارۃ النص یا دلالت النص سے نہیں بلکہ ظواہر نصوص

سے واضح طور پر برآمد ہوتے ہیں اور اس بنا پر جس طرح کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا

جب تک کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا کا رسول نہ مانے اسی طرح ایسے شخص کا ادعا اسلام

صحیح نہیں ہے جو مندرجہ بالا نتیجہات پر ایمان و اعتقاد نہ رکھے۔ جمہور امت کا ہر قرن اور ہر زمانہ میں

اس پر اتفاق رہا ہے۔ اور جس کسی نے اس کا خلاف کیا اُسے مرتد قرار دیکر گردن زدنی قرار دیا گیا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں، "سلف ان لوگوں کو بھی کہتے تھے جو صفات کی نفی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ قرآن مخلوق ہے اور یہ کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رویت نہیں ہوگی، کیونکہ ہم سب سے پہلا شخص ہو جس نے نفی اسرار و صفات کی بدعت جاری کی اور اُس میں انتہائی غلو اور انہماک سے کام لے کر بار بار اُس کی دعوت دی جد بن درہم نے بھی مسلمانوں کو اس فتنہ عظیم میں مبتلا کرنا چاہا تو خالد بن عبد اللہ القسری نے جو عراق کا گورنر تھا عین بقر عید کے دن جد کو ذبح کر دیا اور ذبح کرتے وقت یہ الفاظ کہے، "لوگو! تم اپنی اپنی قربانیاں کرو، اللہ تمہاری قربانیاں قبول فرمائے۔ میں جد بن درہم کو قربان کرتا ہوں۔ یہ شخص اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا دوست نہیں بنایا تھا۔ اور اُس نے حضرت موسیٰ سے کلام بھی نہیں کیا تھا، اللہ ان تمام چیزوں سے بلند و بالا ہے"

پس جہاں تک اسلامی عقائد کا تعلق ہے، ہر اُس شخص کے لئے جو اپنے تئیں مسلمان کہتا ہے ناگزیر ہے کہ وہ قرآن مجید کو مع الفاظ و معانی کے اللہ کا کلام مانے اور دل سے اُس کا اعتقاد لازم رکھے۔ دنیا بھر کے تمام جزئی اختلافات کے باوجود یہی اعتقاد ایک ایسا رشتہ اتحاد ہے جو دنیا کے تمام مسلمانوں کے درمیان ہر قرن اور ہر زمانہ میں قائم رہا ہے۔ اگر کوئی مدعی اسلام آج اس اعتقاد پر قائم نہیں ہے تو جس طرح زمانہ سلف میں ایسے گمراہ لوگوں کو مسلمانوں کی برادری سے خارج کر دیا گیا تھا۔ یہ شخص بھی ہمارے اسی سلوک کا مستحق ہونا چاہئے۔"

## خدا کی صفاتِ ایتہ پر ایک عام بحث

موجودات کی تین قسمیں ہیں (۱) وہ ذات جن کا وجود خارج میں متحقق ہے (۲) افعال جو ذات سے صادر ہوتے اور مفعولات میں پائے جاتے ہیں (۳) صفات جو ذات کے حالات ہوتی ہیں۔ وجود کے اعتبار سے ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ ذات کا وجود خود ان کے ساتھ قائم رہتا ہے یعنی ان کا وجود اضافی نہیں بلکہ حقیقی ہوتا ہے اس کے برعکس افعال کا وجود فاعل کے وجود پر موقوف ہوتا ہے۔ ورنہ فی حد ذاتہ ان کا اپنا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اب رہے صفات تو انکی حقیقت یہ ہے کہ یہ ان حالتوں یا کیفیتوں کا نام ہے جو ذات میں پائی جاتی ہیں اور صفات کا وجود ذات میں ان کے ساتھ ساتھ اور ان کی وجہ سے ہی ہوتا ہے۔ افعال میں اور صفات میں فرق یہی ہے کہ صفات کا قیام ذات کے ساتھ ہوتا ہے۔ اور افعال کا صدور اگرچہ فاعل سے ہوتا ہے لیکن ان کا قیام و بقا فاعل کی ذات کے ساتھ نہیں ہوتا۔ پہلی قسم کی مثال انسان ہے۔ دوسری قسم کی مثال حرکت اور تیسری نوع کی مثال حیا، سخاوت اور شجاعت وغیرہ ہے۔

یہ مسلم ہے کہ کوئی موجود بھی خواہ وہ ذات ہو یا صفت ہو یا فعل ہو اس کا وجود بہر حال از خود نہیں ہے بلکہ اس کا اصل مصدر و منبع ذات واجب الوجود ہے۔ پھر یہ بھی مسلم ہے کہ موجوداتِ ثابثہ میں اولاً وجود ذات کا ہوتا ہے پھر صفات کا اور ان کے بعد افعال و جو و پذیر ہوتے ہیں۔ اب اس پر اس ایک مقدمہ کا اور اضافہ کیجئے کہ صفات و حالات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک تو وہ جو اشیاء کے لئے بذاتہا پائے جاتے ہیں یعنی کسی شے کا وہ شے ہونا ہی ان صفات کے وجود کی سب سے بڑی

دلیل ہوتا ہے اور اس کے لئے کسی اور علت موجبہ کی احتیاج نہیں ہوتی۔ اس کے علاوہ دوسری قسم کی صفات وہ ہیں جن کے وجود کے لئے محض کسی شے کا شے ہونا کافی نہیں ہوتا، بلکہ ان کا وجود کسی علت و سبب موجبہ کا محتاج ہوتا ہے۔ پہلی قسم کی مثال یہ ہے کہ جیسے گرمی آگ کے لئے اور ٹھنڈک برف کے لئے۔ ظاہر ہے کہ محض آگ کا آگ ہونا، اور برف کا برف ہونا وجود و حرارت و برودت کے لئے کافی ہے۔ اُس کے لئے کسی علت خارجی کی ضرورت نہیں، یا مثلاً یہ کہ ہر مثلث کے تین زاویے اُس کے دو قائموں کے برابر ہوتے ہیں یہ بالکل صاف ظاہر ہے کہ محض مثلث کا مثلث ہونا یعنی اُس کی ہُویت ہی اس کی اس صفت کی سب سے بڑی دلیل ہے کہ اُس کے تینوں زوایا دونوں قائموں کے برابر ہیں۔

دوسری قسم کی صفات کی مثال یہ ہے کہ جیسے آگ کے قریب ہونے کی وجہ سے پانی میں حرارت کا یا برف ڈلنے سے اس میں برودت کا پیدا ہونا جو صفات کسی شے کے لیے لذاتہ ہوتی ہیں، ان کو طبیعت اور خاصیت کہا جاتا ہے۔ ان صفات کے حصول فی الذات کے لیے نفس ذات کے سوا نہ کوئی سبب خارجی ہوتا ہے اور نہ کوئی اور صفت ہی اس کے لیے سبب بنتی ہے، افعال کا ذات سے جو صدور ہوتا ہے وہ انہیں طبائع اور خواص کے مطابق ہوتا ہے جو ذات کے لیے صفات اولیہ و ذاتیہ کہلاتے ہیں۔

اس تمہید سے یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ کسی شے کے لیے جو صفات ذاتیہ ہوں گی وہ اُس ذات کے ساتھ ساتھ پائی جائیں گی۔ خواہ ان صفات کا اُس ذات سے صدور ہوا ہو یا نہ ہو۔ مثلاً جو شخص سخی ہے۔ جب تک وہ موجود ہے سخی کہلائے گا۔ یہاں جو شخص بہادر ہے۔ بہر حال وہ بہادر ہے۔ خواہ اُس سے اب تک شجاعت اور سخاوت کا علم صدور نہ ہوا ہو۔ کیونکہ سخی اور شجاعت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ سخاوت اور شجاعت کے موقع پر یہ شخص سخاوت اور شجاعت کے جوہر دکھائے گا تو ہمارا یہ کہنا خود اس بات کی

دلیل ہے کہ ہم نے صدور فعل سے پہلے ہی اُس کو وصف شجاعت و سخاوت کے ساتھ متصف مان لیا ہے، زیادہ سے زیادہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب تک کسی شخص سے ملکہ سخاوت و شجاعت کا عملی اظہار و صدور نہ ہوگا۔ ہم اُس کو کس طرح سخی یا شجاع کہہ سکتے ہیں لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کسی شے کے متعلق ہمارا عدم علم اُس شے کے عدم کی دلیل نہیں ہو سکتا۔ اگر آپ کسی فصیح و بلیغ مقرر و خطیب کی تقریر لیں اب تک نہیں سنی ہے تو یہ کس طرح اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ وہ مقرر و خطیب سرے سے فصیح و بلیغ ہی نہیں ہے۔ اس سے یہ نتیجہ صاف طور پر نکل آتا ہے کہ خدا میں جو صفات پائی جاتی ہیں۔ اسکے وجود کیلئے تخلیق عالم کی ضرورت نہیں ہے۔ اُس میں صفت خلق و رزق کا پایا جانا اس کا علیم ہونا مکمل ہونا اور اُس کا صفت سمع و بصر و متصف ہونا اسپر بوقت نہیں ہے کہ اُس کے بالمقابل کوئی شے مرزوق اور مخلوق وغیرہ بھی پائی جائے بلکہ وہ اپنی تمام صفات کمالیہ سے علی وجہ التمام و الکمال اُس وقت بھی متصف تھا جبکہ صرف وہ ہی وہ تھا اور اُس کے علاوہ تمام چیزیں ”ولم یکن شیاء مذکوراً“ کے حجاب غلیظ میں مستور تھیں۔

اب رہی یہ بات کہ خدا میں کون کون سی صفات پائی جاتی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم جس ذات گرامی کو خدا کہتے ہیں وہ تمام صفات کمالیہ کی مجتمع ہے اور اس کی واضح ترین دلیل یہ ہے کہ جس طرح ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے متنبی کا مشہور مصرعہ ہے

و یضدھا تبتین الا شیاء

اسی طرح کسی چیز کا ناقص ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے بالمقابل کوئی اور کامل چیز پائی جا رہی ہے۔ پھر یہ ظاہر ہے کہ کمال اور نقص دو قسم کے ہوتے ہیں ایک حقیقی اور دوسرا اضافی۔ کمال حقیقی سے مراد یہ ہے کہ وہ ستر یا کمال ہی کمال ہو اور اُس میں ادنیٰ سا شائبہ نقص بھی نہ پایا جائے اسی طرح نقص حقیقی کے معنی یہ ہیں کہ وہ سر بسر ناقص و غیر مکمل ہو اور اُس میں کمال کی ہلکی سی آمیزش

بھی نہ ہوں دونوں کے درمیان نقص و کمال اضافی کا وجود ہوتا ہے جس کے مراتب بشمار نکلتے ہیں۔ پس جس طرح ہمارا وجود ناقص ایک کامل اور ابدی و ازلی وجود کا پتہ دے رہا ہے اسی طرح ہماری صفات کمال کا نامکمل و ناقص ہونا اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ بالیقین کوئی ذات گرامی ایسی موجود ہے جس میں یہ تمام صفات کمال کے مرتبہ قصویٰ کے ساتھ پائی جائیں اور اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے کہ یہ ذات بجز اُس کے کوئی اور نہیں ہے جو سرخسپہ وجود اور مبارک فیاض عالم ہے خدا کے لیے اثبات صفات کمالیہ کی دوسری دلیل یہ ہے کہ انسان میں جو صفات کمالیہ پائی جاتی ہیں وہ ظاہر ہے کہ انسان کے لیے اصلی اور ذاتی نہیں ہیں اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ جو شے اصلی اور ذاتی نہیں ہوتی وہ کسی غیر کی معلول ہوتی ہے۔ اس بنا پر لا محالہ ہماری تمام صفات کمال کسی غیر کا معلول ہونگی اور آخر کار یہ سلسلہ کسی ایسی ذات پر منتهی ہو گا جو تمام اشیاء کی علت تامہ و مطلقہ ہے اور خود وہ کسی کا معلول نہیں۔ ورنہ پھر دور یا تسلسل لازم آئے گا اور چونکہ ذات گرامی صفت وجود میں اکمل ہے۔ اس لئے اُس کی ہر ہر صفت کمال بھی ایسی ہی اکمل ہوگی۔

اب مذکورہ بالا تقریر کو اول سے آخر تک پھر ایک مرتبہ غور و خوض سے پڑھئے تو یہ نتیجہ

بالکل برہی طور پر نکل آتا ہے کہ

(۱) خدا کی ذات متحج ہے تمام صفات کمالیہ کو

(۲) یہ تمام صفات اُس کی ذات کے ساتھ قائم اور ازلی و ابدی ہیں۔

صفات کی حقیقت | ہم خدا کی صفات کی نسبت صرف اتنا ہی جان سکتے ہیں اور جاننا چاہئے۔ اس سے متجاوز ہو کر اگر آپ یہ پوچھیں کہ ان صفات کی حقیقت کیا ہے؟ اور ان کا قیام ذات باری کے ساتھ کس نوعیت کا ہے؟ تو ہم اس کے جواب میں صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ہم صفات باری کو اپنی صفات پر قیاس نہیں کر سکتے؛ یعنی ہم جس طرح یہ کہتے ہیں کہ ہمارے لیے بھی وجود ہے

اور خدا کے لیے بھی، لیکن باہم ہم پورے وثوق اور یقین سے جانتے ہیں کہ خدا کا وجود ہائے وجود کی طرح نہیں ہے۔ ٹھیک اسی طرح ہم کو یقین رکھنا چاہئے کہ خدا پر اور ہم پر صفات کمال کے فضلی اطلاق کے باوجود ہماری ان صفات کو خدا کی صفات پر کسی طرح قیاس نہیں کیا جاسکتا، مثلاً یوں سمجھئے کہ خدا کو رحمن اور قہار کہا جاتا ہے اور وہ بے شبہ ان صفات کے ساتھ بدرجہ اتم موصوف ہی، لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اُس کا رحم اور قہار ہمارے رحم اور قہار کے مانند نہیں ہے و جب یہ ہے کہ رحم اور قہار کے مفہوم میں تاثر و انفعال داخل ہیں یعنی ہم کسی پر رحم کرتے ہیں تو یہ نتیجہ ہوتا ہے ہمارے نفس کی رقت کا جو کسی قابل رحم چیز کو دیکھ کر ہائے اوپر طاری ہو جاتی ہے اسی طرح قہار ہائے نفس کے ہیجان و ثوران کا ثمرہ ہوتا ہے جو کسی ناگوار طبع چیز کے دیکھنے سے ہائے احساس و شعور پر مستولی ہو کر قوت غضبی کو برانگیختہ کر دیتا ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ رحم اور قہار دونوں کی تعریف میں مبداء اور غایت کے لحاظ سے دو چیزیں شامل ہیں۔ مبداء کے مرتبہ میں انفعال و تاثر ہے اور غایت کے درجہ میں فعل و تاثر۔ اور چونکہ خدا کی ذات انفعال و تاثر سے منزہ ہے اس لئے اُس کا رحمن و قہار ہونا صرف غایت کے لحاظ سے ہے مبداء کے اعتبار سے نہیں۔ یہ ایک ایسی واضح بات ہے کہ کسی سلیم الطبع انسان کے لئے اس سے انکار ہو سکتا ہے اور نہ کوئی شک و شبہ، اسی پر خدا کی دوسری صفات مثلاً علم، ارادہ، مشیت قدرت اور کلام کو قیاس کر لیجئے۔ ان کمالات کا اطلاق جن معانی سے ممکنات پر ہوتا ہے خدا پر نہیں ہو سکتا۔

اب اس امر کو تسلیم کرنے میں کوئی شبہ نہیں ہونا چاہئے کہ ہم خدا کی صفات کی نسبت صرف اتنی ہی جان سکتے ہیں کہ خدا میں یہ صفات پائی جاتی ہیں۔

دور بینانِ بارگاہِ التَّوْحِيدِ خیر ازیں پے نبردہ اند کہ مست

باقی رہا یہ سوال کہ کیونکر؟ اور کس طرح؟ تو ہم اس کی نسبت کچھ نہیں بتا سکتے۔ کیونکہ کوئی چیز



ایسی موجود نہیں ہے جس پر ہم خدا کی ذات و صفات کو قیاس کر سکیں۔ اس کے لیے نہ کوئی نذر (مثل) ہے اور نہ ضد۔ اس نے خود فرمایا ہے "لیس مثلہ شیء" اکبر الہ آبادی مرحوم نے کیا خوب کہا ہے۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا بس جان گیا میں تری پہچان ہی ہے

پھر ذرا اس پر بھی غور کیجئے کہ خدا کی ذات و صفات کا کیا ذکر! خود ہمارے اندر کتنی باطنی قوتیں اور ملکات ہیں جن کو ہم ان کے آثار سے پہچانتے ہی نہیں بلکہ ان کے وجود کا یقین رکھتے ہیں، اور اس کے باوجود ہم ان کی حقیقت و ماہیت سے بے خبر ہیں۔ خود علم کو لیجئے، کچھ بچہ اور جاہل سو جاہل انسان بھی علم کی فیصلت اور برتری کا معترف ہے۔ لیکن علم انسانی کی حقیقت کیا ہے؟ وہ صورتہ صلہ فی العقل ہے؟ یا حصول صورت کا نام علم ہے؟ یا خود قوت مدبر کہہ کر کہہ لیتے ہیں؟ یا عالم اور معلوم کے درمیان جو نسبت رابطہ ہے وہ علم ہے؟ علم کے سلسلہ میں یہ اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جن کا قطعی اور حتمی جواب آج تک نہیں دیا جاسکا، نفس ناطقہ انسانی کو سب یہ کہتے ہیں کہ وہ مبداء اور اک ہے کلیات و جزئیات کے لیے عقل کو دنیا جانتی ہے کہ وہ انسان کے لئے سب سے بڑا ظرفاً شرف و امتیاز ہے۔ روح کے متعلق کس کو خبر نہیں کہ زندگی کا دار و مدار اس کے اتصال باجسم پر موقوف ہے لیکن جب سوال کیا جاتا ہے کہ نفس ناطقہ کیا ہے؟ عقل کی حقیقت و ماہیت کیا ہے؟ روح کی حد تمام کیا ہے؟ تو ان سوالات کے جواب میں فلاسفہ کے نظریات اس درجہ مختلف نظر آتے ہیں کہ ان کی روشنی میں کسی ایک قطعی نتیجہ تک پہنچنا دشوار بلکہ ناممکن ہو جاتا ہے، پس جب ان چیزوں کی نسبت ہمارا علم اس قدر محدود ہے تو پھر ظاہر ہے کہ خدا کی ذات و صفات کے بارے میں ہماری رسائی کہاں تک ہو سکتی ہے کسی نے سچ کہا ہے۔

تو براوج فلک چہ دانی چلیت چوں ندانی کہ در سرائے تو کیت

صفت ذات اور صفت فعل | آپ پڑھ آئے ہیں کہ صفات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک صفات ذاتیہ

جو ذات کے ساتھ قائم ہوتی ہیں۔ اور دوسری وہ جو ذات کے ساتھ قائم نہیں ہوتیں۔ خدا کی صفات بھی دو قسم کی ہیں۔ علامہ ابن تیمیہ اُن کو صفت ذات اور صفت فعل سے تعبیر کرتے ہیں۔ خدا کی صفات ذاتیہ کا تعلق اُس کی ذات کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے پھول کے ساتھ رنگ و بو۔ آفتاب کے ساتھ حرارت اور روشنی۔ پانی کے ساتھ برودت۔ اور آگ کے ساتھ گرمی کا تعلق و قیام ہے۔ یہی صفت فعل تو یہ وہ صفت ہے جو کسی معلول یا مفعول کے ساتھ تعلق کی وجہ سے خدا کے لئے حاصل ہوتی ہے۔ مثلاً آگ کی ایک صفت حرارت ہے جو اُس کے لئے ذاتی ہے۔ جب آگ کا وجود ہوگا حرارت ضرور پائی جائے گی اور ایک صفت ہے جلانا، ترظاہر ہے کہ یہ صفت اُس رابطہ پر دلالت کرتی ہے جو آگ کے اور کسی اور چیز کے درمیان پایا جاتا ہے، اس پر ہی خدا کی صفت فعل کو قیاس کر لیجئے، یعنی یہ صفت کسی خاص فعل کے اعتبار سے اُس تعلق کو ظاہر کرتی ہے جو خدا اور اُس کے بندہ کے درمیان ہوتا ہے۔ اس صفت کی نسبت دو باتیں بالکل واضح طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ صفت ذات کی طرح اس صفت کا موصوف بھی ذات ہی ہوگی کیونکہ جس طرح صفت ذات کا قیام و تعلق ذات کے ساتھ ہے اسی طرح اس صفت کا مبداء و رجبی ذات ہی ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگرچہ صفت فعل، صفت ذات کا ہی پر تو ہوتی ہے، لیکن چونکہ یہ صفت اُس تعلق کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے جو کسی دوسری شے کے ساتھ ہوتا ہے، اس لئے اس صفت کو ذات موصوف کے ساتھ وہ تعلق نہیں ہوتا جو صفت ذات کو ہوتا ہے۔ اس بنا پر اس صفت کا ظہور جو مختلف اشکال و صور میں ہوتا ہے اُس کا اثر ذات پر کچھ نہیں ہوتا۔ یعنی یہ نہیں کہا جاسکتا کہ صفت کی وجہ سے ذات موصوف میں کوئی تغیر پیدا ہو گیا ہے۔

تعد و صفات اور وحدانیت ذات | اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ خدا کے لیے متعدد صفات کا پایا جانا اس بات کو متلزم نہیں ہے کہ خود اُس کی ذات میں بھی تعد و یا ترکیب پایا جائے۔ کیونکہ

ہم مخلوقات میں دیکھتے ہیں کہ کثافت کے باوجود متعدد اشیاء کے اعتبار سے ایک شے کے لیے ہزاروں صفات و اقباب ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک آدمی کسی کا باپ کسی کا بھائی، کسی کا خاوند۔ کسی کا چچا اور کسی کا بھتیجہ کہلاتا ہے۔ ان تمام مختلف اقباب کے باوجود یہ شخص شخص واحد ہی رہتا ہے۔ اور اُس کے ایک ہونے میں فرق نہیں پڑتا۔ پس جب کثیف چیزوں کا یہ حال ہے تو ظاہر ہے خدا کی صفات کے تعدد سے اُس کی ذات میں کس طرح تعدد پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ تو تمام موجودات سے زیادہ لطیف بلکہ سرختمہ لطافت ہے۔ اور اُس میں کوئی شبہ نہیں کہ بہ نسبت کثیف کے لطیف میں تعدد و کثرت بہت کم ہوتا ہے اس سے صاف طور پر یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ وہی ایک ذاتِ خداوندی ہے جو کسی جہت سے خالق کسی وجہ سے رازق اور کسی محاط سے مستکم اور کسی اعتبار سے رحمن اور قہار و جبار ہے اسی حقیقت کو ایک اور واضح تر مثال سے سمجھئے، آفتاب کو طلوع کے وقت دیکھئے، کتنا بڑا اور انگاروں کی طرح سُرخ اور بے شعاع نظر آتا ہے۔ پھر بلند ہو کر سفید دکھائی دیتا ہے اور مقدار میں چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد جب غروب ہونے لگتا ہے تو زرو بن جاتا ہے ان سب صورتوں میں یونہی کہتے ہیں کہ آفتاب کو دیکھا۔ اب غور کیجئے، کیا یہ تمام تغیرات ذاتِ آفتاب میں ہوتے ہیں؟ ہرگز نہیں، بلکہ یہ زردی، سرخی، مقدار کا بڑا ہونا، اور چھوٹا ہونا، یہ سب ہماری نظر کے تاثرات و انفعالات ہیں جو آفتاب کے ایک خاص جہت میں نظر آنے اور اُس کی شعاعوں کے زمین تک پہنچنے اور ان شعاعوں کے زمین پر عمودی شکل میں یا ترچھے پڑنے کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ورنہ آفتاب ان تمام حالات میں یکساں رہتا ہے۔ اور اس کی مقدار میں نہ زیادتی ہوتی ہے اور نہ کمی، پس جس طرح آفتاب ایک متعین رنگ رکھنے کے باوصف، مختلف اوان و صورت میں جلوہ نما ہوتا ہے اور طرح طرح سے تجلی کرتا ہے۔ ایسے ہی حضرت باری عز و جل ذاتِ واحدی، اُس میں کسی قسم کا تعدد نہیں، لیکن باہر تجلیات متعدد رکھتا ہے اور ان تجلیات سے کام صفات

کا کتاب ہے۔

صفات کا تصور حوادث میں | اس تقریر سے یہ بات بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ خدا کی صفات کا تصور حوادث کی شکل صورت میں تاہی لیکن اس کے باوجود ہم ان حوادث پر قیاس کر کے صفات کو حادث نہیں کہہ سکتے، وہ بدستور قدیم ہی رہیں گی۔ اور اگرچہ تجلی کی صورت میں صفات کے لئے بہ ظاہر تغیر و تبدل پایا جائے گا۔ لیکن یہ محض نظر کا دھوکا ہوگا۔ درندہ دراصل وہ غیر متغیر و غیر تبدل ہیں۔ مثال کے لئے ایک ایسی لالٹین کا تصور کیجئے جو ہمیشہ پہلو ہے اُس کے چاروں طرف آٹھ مختلف رنگوں کے شیشے لگے ہوئے ہیں اور ان سب کے اندر ایک چراغ رکھا ہوا ہے اب دیکھئے چراغ کے لئے ایک روشنی تو وہ ہے جو چراغ کی ذات کے ساتھ قائم ہے، یہ روشنی مطلق ہے کسی رنگ یا کسی مقدار کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایک روشنی وہ ہے جو رنگین شیشوں کے عکس سے چھن چھن کر مختلف رنگوں کے ساتھ نظر آرہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں روشنیاں چراغ کی ہیں کیونکہ سبز یا سرخ روشنی کو کوئی نہیں کہتا کہ یہ سبز یا سرخ شیشہ کی روشنی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ پہلی قسم کی روشنی مطلق روشنی ذاتِ چراغ کے ساتھ قائم ہے۔ کوئی شیشہ نہیں ہوگا۔ تب بھی یہ روشنی پائی جائیگی، لیکن دوسری روشنی کے تصور و قیام کا تعلق شیشہ کے ساتھ ہے۔ چنانچہ اگر آپ ان آٹھوں شیشوں میں سے کوئی شیشہ لالٹین سے نکال لیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ اُس شیشہ کے رنگ کی روشنی بھی یکساں غائب ہو جاتی ہے۔ اس مثال میں تین باتیں خاص طور پر لائق توجہ ہیں۔

(۱) جنے مختلف رنگوں کی روشنیاں نظر آرہی ہیں وہ سب شمع کی ہیں۔

(۲) شمع کی روشنی بذاتِ خود ان رنگوں میں سے کسی خاص رنگ کے ساتھ مقید نہیں۔ لیکن

یہ واقعہ ہے کہ شمع کی روشنی کا مختلف رنگوں میں نظر آنا شیشوں کی وجہ سے ہی ہے۔

(۳) رنگ اور روشنی دونوں الگ دو چیزیں ہیں لیکن دونوں میں تعلق یہ ہے کہ روشنی ظاہر

ہے اور رنگ منظر یا دوسرے لفظوں میں یہ کہتے کہ روشنی متجلی ہے اور رنگ متجلی فیہ۔ اور اس تعلق کے باعث دونوں میں ارتباط اس درجہ شدید ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا اس میں خاص طور پر محاط کے قابل چیز یہ ہے کہ روشنی کا سرخ یا سبز ہونا شیشہ پر روشنی کا پرتو پڑنے کی وجہ سے ہے۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ روشنی کے لیے بذاتہ کوئی رنگ نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود سرخی یا سبزی کی صفت ثابت ہوتی ہے روشنی کے لیے ہی نہ کہ شیشہ کے لیے۔ کیونکہ یہاں روشنی اور رنگ میں ذاتاً الگ الگ ہونے کے باوجود اس قدر زبردست اختلاط و ارتباط ہے کہ گویا دونوں ایک ہی ہیں اور ان میں سے ایک کا قیام دوسرے کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسا کہ صفت ذاتی کا قیام و تعلق موصوف کے ساتھ... جن سطور پر خط کھینچا ہوا ہے۔ ان کو بار بار پڑھو اور غور کیجئے تو آپ کو صفات خداوندی کی تجلی اور حوادث کی شکل میں ان کے ظہور پر بڑی بصیرت حاصل ہوگی اور بڑے بڑے خدشات و وساوس کا حل معلوم ہو جائے گا۔

مزید توضیح کی غرض سے ایک اور مثال نقل کرتا ہوں جس سے اصل مسئلہ پر زیادہ روشنی پڑتی ہے۔ آپ روزانہ دیکھتے ہیں کہ کسی ریڈیو اسٹیشن سے ایک تقریر نشر کی جاتی ہے اور آپ اسے اپنے ریڈیو سٹ میں سنتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ریڈیو سٹ میں ایک پیچ لگا ہوا ہوتا ہے جس کو انگریزی میں وولیوم کنٹرول (Volume Control) کہتے ہیں اور جس سے آواز کو کم یا زیادہ کرنے کا کام لیا جاتا ہے، اب اس پر غور کیجئے کہ جہاں تک آواز کا تعلق ہے وہ بالکل کیسا ہر یعنی مقرر ایک ہی آواز سے اول سے آخر تک اپنی تقریر کو پڑھتا چلا جاتا ہے۔ اس میں نہ تیزی پیدا ہوتی ہے اور نہ ہلکا پن لیکن ادھر حال یہ ہے کہ آپ اس پیچ کو دو ایک چکرتی ہیں تو آواز ہلکی اور مدہم نکلتی ہے اور اگر اس کو زیادہ گھاتے ہیں تو آواز بلند ہو جاتی ہے۔ اب یہ ظاہر ہے کہ آواز کا ہلکا ہونا یا تیز ہونا آواز کی ذاتیات میں داخل نہیں ہے اور آپ کے پیچ گھمانے سے مقرر کی اصل

آواز میں کوئی تغیر بھی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن اس کے باوجود یہ ہلکا پن یا تیزی صفت کس کی ہے؟ آواز کی ہی یا کسی اور چیز کی؟ ظاہر ہے کہ آواز ہی کی صفت ہے اور دلیل یہ ہے کہ آپ آواز کے گھٹنے بڑھنے پر بے تکلف بول اٹھتے ہیں کہ آواز کم ہو گئی یا زیادہ ہو گئی۔

چونکہ صفات ایزدی کی تجلی کا مسئلہ نہایت دقیق ہے۔ اور اس کی تشریح و توضیح فلسفیانہ اصطلاحات کی روشنی میں بہت ہی مشکل ہے۔ چنانچہ عرفی نے کہا ہے۔

نورِ حیرت در شبِ اندیشہ اوصاف تو بس ہایوں مرغِ عقل از آسشیاں انداختہ  
 اور ہونا بھی یہی چاہئے۔ بھلا ایک قطرہ بے مقدار کس طرح بحرِ ناپیدا کنار کو اپنی آغوش میں لے سکتا ہے؟  
 اس بنا پر اس حقیقت کے انعام و تفہیم کے لیے بہترین طریقہ مثالوں کا ہی ہو سکتا ہے۔ ہم ذیل میں ایک اور مثال کے ذریعہ اس کی تشریح کرتے ہیں، آفتاب کی روشنی کو دیکھئے۔ اس کے لیے کوئی خاص مقدار یا شکل نہیں پائی جاتی۔ لیکن اگر اس کا گزرا ایسے روشندان سے ہو جو مثلث یا مربع شکل کا ہو تو خود آفتاب کی روشنی بھی اسی شکل سے مشکل ہو جاتی ہے۔ اب غور کیجئے روشنی اور شکل دو مختلف چیزیں ہیں لیکن صورت یہ ہے کہ روشنی کا گزرا روشندان میں سے ہو رہا ہے اور روشندان ایک خاص شکل رکھتا ہے۔ روشندان میں سے گزرنے کی وجہ سے، یا بالفاظِ صحیح تر، روشندان کو اپنا جلوہ گاہ بنانے کے باعث روشندان کی شکل خاص خود روشنی کے لئے حاصل ہو گئی اور اب آپ اس شکل کا حمل و انصاف روشنی کے لئے ایسا ہی کرتے ہیں کہ گویا وہ روشنی کے لئے کوئی صفت ذاتی ہو۔  
 صفاتِ لائین و لاغیر ہیں | مذکورہ بالا مثالوں پر غور کرنے سے علمِ کلام کے ایک مشہور و معروف مسئلہ کا بھی حل نکلا آتا ہے یعنی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ صفاتِ باری تعالیٰ کو ذاتِ باری سے ایسی نسبت ہی کہ نہ ان کو عین ذات کہہ سکتے ہیں اور نہ غیر ذات، کیونکہ سُرخ یا سبزی روشنی سے۔ مثلث یا مربع شکل آفتاب کی دھوپ سے کمی یا زیادتی آواز سے غیر بھی ہیں اور عین بھی۔ غیر اس اعتبار سے کہ یہ چیزیں

موصوف کی ذات کا عین نہیں ہیں۔ شمع کی روشنی پائی جاتی ہے اور سُرخ یا سبزی کا وجود نہیں ہوتا۔ دھوپ کا وجود پایا جاتا ہے اور شکل مثلث یا مربع کا کہیں پتہ نہیں ہوتا۔ اور عین اس بنا پر ہیں کہ شمع کی روشنی جب تک رنگین شیشوں کے درمیان مھور ہے اور آفتاب کی دھوپ جب تک مثلث یا مربع شکل کے روشندان میں سے گذرتی رہے گی۔ بہر حال شمع کی روشنی کے لئے رنگین اور دھوپ کے لئے مثلث یا مربع ہونا ضروری ہے اور ان دونوں میں سے کسی ایک کا انفساک دوسرے سے نہیں ہو سکتا۔

حوادث کا قیام ذاتِ باری سے | اس تقریر سے ایک اہم مسئلہ پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ مسکلیں عام طور سے کہتے ہیں کہ حوادث کا قیام ذاتِ باری کے ساتھ نہیں ہو سکتا۔ یہ کہنے کی بنا پر خدا کی صفات فاعلی کے متعلق طرح طرح کے اشکالات پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک کلام کے مسئلہ کو ہی لے لیجئے، اگر یہ مطلقاً درست مان لیا جائے کہ ذاتِ باری کے ساتھ حوادث کا تعلق اور قیام نا جائز ہو تو اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر قرآن مجید کے الفاظ و حروف اور ان کی ترکیب و ترتیب جو یقیناً حادث ہیں ان کو خداوند تعالیٰ کی طرف کس طرح منسوب کر سکتے ہیں۔ حالانکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآنِ معنی نے الفاظ کے خدا کا کلام ہے۔ جیسا کہ وانزلنا القرآن ناعربیاً اور اسی طرح کی اور متعدد تصریحات سے خود قرآن مجید سے ثابت ہے۔ اس اعتراض سے بچنے کے لیے ہی مسکلیں نے کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کا فرق کیا ہے۔ اور انہوں نے کہا ہے کہ القرآن کلام اللہ غیر مخلوق جو کہا جاتا ہے تو وہ کلامِ نفسی کے اعتبار سے کہا جاتا ہے، نہ کہ کلامِ لفظی کے لحاظ سے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کی تفریق خود قرآن مجید کی نصوص کے خلاف ہے اور اس تفریق سے معتزلہ اور اشاعرہ کا اختلاف بھی محض ایک لفظی اختلاف ہو کر رہ جاتا ہے۔

لے بزرگوں سے سنا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث مولانا محمود حسن دیوبندی فرمایا کرتے تھے کہ اگر واقعی قرآن مجید (بقیہ صفحہ آئندہ)

غالباً اس عقده کی گرد کشائی سب سے پہلے حافظ ابن تیمیہ نے کی ہے انہوں نے متعدد مواقع پر لکھا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ حوادث کا قیام ہو سکتا ہے اس مدعا کو ثابت کرنے کے لیے امامِ عالی مقام کے نزدیک ترتیب مقدمات یہ ہے۔

(۱) قرآن مجید سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ سے کلام کیا۔

(۲) یہ کلام اور مخاطبت ازل میں نہیں تھی بلکہ حادث تھی۔

(۳) کلام کے لئے ضروری ہے کہ مستلم کے ساتھ قائم ہو۔

ان مقدمات کی ترتیب سے یہ نتیجہ نکل آتا ہے کہ ذاتِ باری کے ساتھ حوادث کا قیام ہو سکتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں: ”ہمارا یہ قول ایک ایسا قول ہے جس کی صحت پر شرع اور عقل دونوں دلالت کرتے ہیں۔ اور جو شخص یہ نہیں کہتا کہ خدا کلام کرتا ہے، ارادہ کرتا ہے، محبوب اور مہنوس رکھتا ہے۔“

راہی ہوتا ہے، آتا ہے اور آتا ہے، تو وہ اللہ کی کتاب سے منافع کرتا ہے اور جو شخص یہ کہتا ہے کہ اللہ نے حضرت موسیٰ کو ندا ازل میں دی تھی۔ اور وہ برابر ندا دیتا رہا تو وہ عقل کی بات سے سرکشی کرنے کے ساتھ ساتھ کلام اللہ کی بھی مخالفت کرنا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَ هَا نُودِيَ  
پس جب موسیٰ وہاں آئے تو انکو ندا دی گئی۔

دیکھئے! اس میں ندا حضرت موسیٰ کی آمد سے موقت ہے، اور ارشاد ہے۔

إِنَّمَا أَهْرَبُكَ إِذْ إِذْ إِذْ شَاءَ إِنْ  
اللہ کا حکم یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا

يقول لَمَّا كُنْ فَيَكُونُ  
ہو تو اس سے کہتا ہے ”ہو جا، اور وہ ہو جاتی ہے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) میں کلامِ نفسی اور کلامِ لفظی کی تفریق ہوتی تو پھر امام احمد بن حنبلؒ کو کیا ضرورت کہ وہ کوثرے کھاتے اور مصیبتیں اٹھاتے وہ کہہ سکتے تھے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ کلامِ نفسی کے اعتبار سے ہے ورنہ کلامِ لفظی تو حادث ہے ہی جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں۔



اس آیت میں اذیٰ "حرف شرط ہے جو استقبال پر دلالت کرتا ہے" ان آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ امور مستجدہ بھی اللہ کی ذات کے ساتھ قائم ہوتے ہیں۔

ایک تنبیہ | لیکن اس تقریر سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ حافظ ابن تیمیہ قرآن مجید کے حروف کو مخلوق مانتے ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیزیں جن کو ہم حوادث سمجھتے ہیں وہ اگرچہ ہمارے اعتبار سے حوادث ہی ہیں لیکن جب ان کے ساتھ خدا کی کسی صفت کا تعلق ہو تو پھر یہ یقین کرنا چاہئے کہ وہ حوادث محض ہمارے اعتبار سے حوادث ہیں جن میں خدا کی کوئی صفت بجلی کر رہی ہے ورنہ درحقیقت وہ حوادث نہیں ہیں۔ اب ذرا شمع کی مذکورہ بالا مثال کو سامنے رکھ کر غور کرو اور دیکھو کہ جب شمع کی روشنی کا عکس کسی رنگین شیشہ پر پڑتا ہے تو شیشہ کی رنگینی کی وجہ سے خود شمع کی روشنی بھی رنگین ہو جاتی ہے تو اگرچہ روشنی کا یہ رنگ شیشہ کے انعکاس کی وجہ سے ہی ہے، لیکن ہے دراصل شمع کی ہی روشنی، اس لئے جو شمع کا حکم ہو گا وہی اس روشنی کا بھی ہو گا پس اسی طرح کلام کی بحث کو سامنے رکھ کر سمجھتے کہ قرآن کے وہ عربی الفاظ و حروف جن سے انسانی کلام مرکب ہوتا ہے، بے شک و شبہ حادث ہیں۔ لیکن جب یہی الفاظ و حروف پر قیاس کر کے مخلوق نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ نے اسی مضمون میں ایک جگہ پر اس کی تصریح کر دی ہے فرماتے ہیں۔

”لیکن سلف کا قول یہ ہے کہ اللہ ہمیشہ سے مکلم ہے اور وہ جب چاہتا ہے کلام کرتا ہے اور کلام ایک صفت کمال ہے۔ کیونکہ جو شخص کلام کرتا ہے وہ نسبتاً اس سے اکمل ہوتا ہے جو کلام نہیں کرتا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کمال ان صفات کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے جو موصوف کے ساتھ قائم ہوں، امور مباہینہ عن الموصوف سے کمال کا تحقق نہیں ہوتا

لے کتاب مذہب السلف التوہم فی تحقیق مسئلہ الکلام اللہ الکریم مطبوعہ المنار مصر ص ۱۱۸ و ۱۱۹

خدا کی صفت کا مظہر اور تجلی کا ہے بن جاتے ہیں۔ تو اب ہم ان کو اپنے کلام کے الفاظ و حروف

پس اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیشہ سے صفات کمال کے ساتھ موصوف رہا ہے اور چونکہ اہم صفات کمال میں سے کلام ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ کو اننا پڑے گا کہ وہ مکمل ازلاً وابداً ہے اور جب چاہتا ہے عربی میں کلام کرتا ہے۔ جیسا کہ اُس نے قرآن عربی کے ذریعہ کلام کیا۔ پھر یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ اللہ تعالیٰ جن الفاظ و حروف کیساتھ کلام کر چکا وہ اس کے ساتھ قائم ہو گئے نہ یہ کہ مخلوق و منفصل ہوں اس بنا پر وہ حروف جو اللہ کے اسرارِ حسنی کے اور اُس کی نازل کی ہوئی کتابوں کے مبنائی ہوں گے وہ مخلوق نہیں ہو سکتے، کیونکہ اللہ نے اُن سے کلم کیا ہے۔

کون نہیں جانتا کہ پانی اُسی وقت پانی ہے جب تک کہ وہ دودھ کے ساتھ نہ ملا ہو لیکن دودھ میں مل جانے کے بعد کوئی اسے پانی نہیں کہتا بلکہ دودھ کہتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ ایک اور موقع پر لکھتے ہیں۔

”اگر مستلزم الخواص ممکن بنفسہ ہو یعنی وہ مفعول، معلول اور مروب کھلائے تو ضروری ہے کہ وہ حادث ہو۔ لیکن اگر وہ واجب بنفسہ ہو تو ضروری نہیں کہ مستلزام الخواص کی وجہ سے وہ خود ممکن ہو جائے۔ یہی قول ائمہ اہل الملل واطالین الفلاسفہ کا ہے اور یہی قول جمہور اہل حدیث کا ہے۔“

عقیدۃ الطحاوی کے فاضل شارح نے بھی اس مسئلہ پر کافی بحث کی ہے اور قریب قریب

۱۔ کتاب مذہب السلف القویم ص ۲۲، ۲۵۱ لے رسالہ صفۃ الکلام ص ۵۳

۲۔ شرح عقیدۃ طحاوی کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے مطبع سلفیہ مصر کا مطبوعہ ہے اس شرح کے فاضل مصنف نے اپنا نام نہیں بتایا، لیکن غالب قیاس یہ ہے کہ اس کے مصنف صدر الدین علی بن محمد بن العزیز الاذری المشقی المحضی الشافعی ہیں جو علامہ ابن کثیر کے شاگرد ہیں، اور صاحب کشف الظنون کے بیان کے مطابق افاضل علماء اراغاف میں سے ہیں۔

دہی لکھا ہے جو حافظ ابن تیمیہ فرما چکے ہیں۔ ذیل میں ہم اُس کا اقتباس درج کرتے ہیں۔  
 «اللہ تعالیٰ صفات کمال، صفات ذات اور صفات فعل دونوں کے ساتھ ہمیشہ سے  
 متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا، کیونکہ خدا کی تمام صفات صفات کمال ہیں اور  
 اُن میں سے کسی ایک کا نہ ہونا صفت نقص ہے۔ اور یہ بھی جائز نہیں ہے کہ اُس کے  
 لیے کوئی صفت کمال حاصل ہو، درآسنا لیکہ وہ پہلے اُس کی ضد کے ساتھ متصف  
 رہ چکا ہو۔»

اس پر صفات فعل اور صفات اختیار یہ مثلاً خلق۔ زندہ کرنا۔ ارنا قبض اور ربط،  
 غضب اور رضا، کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔ اگرچہ ہم کو اُس کی کنہ اور حقیقت معلوم  
 نہیں ہے۔ لیکن اصل معلوم ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ امام مالک سے ثمر استویٰ علی  
 العرش کی تفسیر پوچھی گئی۔ تو انھوں نے فرمایا کہ «استوار معلوم ہے۔ لیکن کیفیت مجہول ہو،  
 ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ احوال ایک وقت میں نہیں ہوتے اور کسی دوسرے وقت میں حادث  
 ہو جاتے ہیں۔ لیکن احوال و افعال کا یہ حدوث ذات خداوندی کے اعتبار سے ممنوع نہیں  
 ہے اور اس پر اس بات کا اطلاق نہیں کیا جاسکتا کہ وہ عدم کے بعد حادث ہو گئے ہیں۔ تم  
 جانتے ہو کہ جو شخص کلام کرنے کی قدرت رکھتا ہو۔ اور وہ آج تمہارے سامنے کلام کرے۔  
 تو تم یہ نہیں کہتے کہ حدث لہ، الکلام۔ کلام اُس کے لئے حادث ہو گیا ہے۔ البتہ ہاں! اگر  
 کوئی شخص گونگا ہو، کلام کی بالکل قدرت نہ رکھتا ہو۔ اور وہ کسی دن کلام کرنے لگے تو  
 اُس کی نسبت یہ کہا جائے گا کہ حدث لہ، الکلام، جو شخص بغیر کسی آفتِ سادی کے غائب  
 ہو وہ خموشی کے وقت بھی متکلم بالقوہ ہے اور اُس کے معنی یہ ہیں کہ وہ جب چاہے کلام  
 کر سکتا ہے پھر جب کلام کرتا ہے تو متکلم بالفعل ہو جاتا ہے۔ پس جس طرح متکلم بالقوہ، بالفعل

کلام نہ کرنے سے یا کوئی کاتب بالقوۃ بالفعل کتابت نہ کرنے سے کسی صفتِ نقص تکلم اور کتابت کی ضد سے متصف نہیں ہوتا۔ اسی طرح سمجھنا چاہئے کہ افعالِ اختیاریہ کا اصطلاحی حدوث باری تعالیٰ کے لئے موجبِ نقص نہیں ہے۔  
اس کے بعد عقیدہ طحاوی کے فاضل شارح لکھتے ہیں :-

اور علم کلام میں یہ جو کہا جاتا ہے کہ خدا میں حوادث کا حلول نہیں ہو سکتا تو یہ ایک قول مجمل ہے۔ اس کا ذکر نہ کہیں قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں، اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر نفی سے مراد یہ ہے کہ خدا کی مقدس ذات میں اس کی محدث مخلوقات میں سے کسی محدث کا نزول اور اس کے لیے کسی وصف متجدد کا حدوث نہیں ہو سکتا۔ تو بے شبہ اس اعتبار سے یہ کہنا..... کہ خدا میں حلولِ حوادث متنع ہے صحیح ہے۔ لیکن اگر اس قول سے مراد یہ ہے کہ خدا سے صفاتِ اختیار یہ کی نفی کر دی جائے اور یہ کہا جائے کہ خدا اپنے ارادہ اور مشیت کے مطابق فعل نہیں کر سکتا اور نہ وہ جب چاہے اور جس طرح چاہے کلام کر سکتا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ اس اعتبار سے یہ کہنا کہ خدا میں حلولِ حوادث نہیں ہو سکتا بالکل غلط اور باطل ہے۔

بڑی مشکل یہ ہے کہ اہل کلام نفی حلولِ حوادث کے الفاظ بہت ہی مبہم طریقہ پر بولتے ہیں راسخ العقیدہ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کہہ کر خداوند تعالیٰ سے ان چیزوں کی نفی کی جا رہی ہے جو اس کی ذات مستحجج الصفات کے شایان نہیں ہیں۔ جب راسخ العقیدہ مسلمان اس کو تسلیم کر لیتا ہے تو پھر اس سے کہا جاتا ہے کہ نفی حلولِ حوادث سے مراد تو یہ تھی کہ خدا سے صفاتِ اختیار یہ اور صفاتِ فعل دونوں کی نفی کر دی جائے۔

(شرح عقیدہ الطحاوی ص ۵۶۱۵)

کلام الہی | یہ جو کچھ عرض کیا گیا، خدا کی عام صفات کے متعلق تھا، ضمناً کلام الہی کا بھی تذکرہ آ گیا ہے اب اس پوری تقریر کو سامنے رکھ کر غور کیجئے تو چند نتائج تین طور پر پیدا ہوتے ہیں۔

- (۱) خدا تمام صفات کمال کے ساتھ متصف ہے جن میں سے ایک صفت کلام بھی ہے۔
- (۲) خدا کی صفات دو قسم کی ہیں ایک صفات ذات اور دوسری صفات فعلی یا فاعلی۔
- (۳) صفات فعلی کا ظہور حوادث کی شکل میں ہوتا ہے یعنی حوادث ان کا منظر بنتے ہیں۔
- (۴) لیکن ان حوادث کو ہم اپنے حوادث پر قیاس نہیں کر سکتے بلکہ صفات فعلی کے ساتھ گہرے ربط کی وجہ سے ان کا حال بھی وہی ہوتا ہے جو صفات فعلی کا ہوتا ہے۔

اب ان صفات پر کلام کی صفت ربانی کو بھی قیاس کیجئے تو اس بات کے ثابت ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں رہتا کہ خدا کی صفت کلام بھی دو طرح کی ہے ایک صفت ذات جو ذات خداوندی کے ساتھ قائم ہے اور جس کے اعتبار سے وہ اُس وقت بھی مکمل تھا جبکہ اُس کے سوا کسی اور چیز کا کہیں وجود نہیں تھا۔ دوسری صفت صفت فعل ہے۔ یہ وہ صفت ہے جس کی وجہ سے خدا کا کلام مختلف زبانوں میں مختلف انبیاء پر نازل ہوتا رہا اور آخر امر عربی زبان میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔

قرآن مع الفاظ کے کلام الہی ہے | فرق باطلہ کو چھوڑ کر بعض علماء حجت تک نے کہا ہے کہ "خدا کی صفت کلام معنی واحد ہے اور اُس میں تعدد، تکثر، تجزی اور بعض مدلول (یعنی معنی و مفہوم) کے لحاظ سے نہیں ہے بلکہ دلالت کے اعتبار سے ہے، اور یہ عبارتیں مخلوق ہیں لیکن ان کو جو کلام اللہ کہا جاتا ہے وہ اس بنا پر کہا جاتا ہے کہ یہ عبارتیں مدلول پر دلالت کرتی ہیں۔ اگر اس مفہوم کو عربی زبان میں ادا کیا جائے تو وہ قرآن ہے اور اگر عبرانی زبان میں ادا کیا جائے تو وہ توراہ ہے پس عبارتیں مختلف ہیں لیکن کلام مختلف نہیں ہے" ابن کلاب اور ابوالحسن اشعری وغیرہ کا یہی قول ہے۔ لیکن

ائمہ سلفِ صالحین کا فیصلہ اس کے خلاف ہے۔ وہ قرآن مجید کو مع الفاظ و معانی کے غیر مخلوق مانتے ہیں اور اوپر جو تقریر گزر چکی ہے۔ اُس کی روشنی میں اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ سلفِ صالحین کے فیصلہ کو صحیح تسلیم کرنے میں کوئی عقلی استحالہ یا استبعاد بالکل نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کلامِ خدا کی صفتِ ازلی وابدی ہے اور اُس کی ذات کے ساتھ قائم ہے لیکن یہ بھی بے شبہ درست ہے کہ اس صفت کا ظہور و بروز مختلف شکلوں اور صورتوں میں ہوتا رہا ہے اور یہ اشکال و صورتوں کا اختلاف اصل صفتِ کلام میں نہیں ہوتا بلکہ ان اذیاء کی وجہ سے ہوتا ہے جو مختلف زبانیں رکھتے تھے اور جن پر کلامِ الہی کا نزول ہوتا تھا۔ پس اگرچہ یہ اختلاف اشکال و صورتوں میں نہیں ہے تاہم مخاطبین کے مختلف احوال و مزایا کے باعث اصل صفت جن مختلف مظاہر میں نظر آ رہی ہے وہ سب مظاہر بھی خدا کی ہی طرف منسوب ہونگے اور شدتِ ارتباط کے باعث ان کا حکم بھی وہی ہوگا جو متعلیٰ کا ہے۔ ایک مرتبہ پھر اسی شمع والی مثال کو سامنے رکھ کر غور کر دیکھ چرائی کی اصل روشنی کی طرح خدا کی صفتِ کلام بھی مقید اور مطلق ہے لیکن جس طرح اُس روشنی کا عکس کسی رنگین شیشہ پر پڑتا ہے تو خود چرائی کی روشنی بھی اسی رنگ میں نظر آتا ہے۔ اسی طرح اُس روشنی کے باعث ہی ہوتا ہے لیکن پھر بھی کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ شیشہ کی روشنی رنگین ہے بلکہ وہ رنگین روشنی بھی شمع کی ہی کہلاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح یقین کر دیکھ کلامِ الہی کی شمع جانفروز بغیر کسی رنگِ مقید و تعین کے اپنی شانِ اطلاق کے ساتھ ازلا و ابداً روشن و تابناک ہے۔ لیکن حضرت موسیٰ کے قلبِ مہلک کا شیشہ اُس نورِ یزید سے منعکس ہوا تو اسی شمع کلامِ الہی کا جلوہ عبرانی شکل میں نظر آیا۔ حضرت داؤد اور حضرت عیسیٰ کے پاک و صاف دلوں کے آئینے اُس روشنی سے عکس پذیر ہوئے تو لوگوں کو اُس شمع کی روشنی زبور اور انجیل کی صورت میں نظر آئی۔ پھر سب سے آخر میں اس شمع کا نور عرب کے ایک قلبِ آئینہ شمال پر اُس کی بساط و مندرت کے مطابق پرتو فگن ہوا تو اُس نور کا ظہور

عربی زبان میں ہوا اور قرآن مجید کہلایا۔ پھر جس طرح مطلق روشنی اور رنگین روشنی دونوں شمع کی ہیں اور آپ رنگ کو روشنی سے جدا نہیں کر سکتے۔ اسی طرح مطلق کلام اور کلام بزبان عربی (قرآن) دونوں خدا کے ہیں اور آپ قرآن کے عربی الفاظ و حروف کو کلام الہی سے خارج قرار نہیں دے سکتے۔ فافهم وتدبر

عجب بات ہے کہ خود قرآن مجید نے نور الہی کو اسی تمثیل سے بیان کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

اللَّهُ نُورُ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ مِثْلُ

نورہ لکشوۃ فیہا مصباحٌ و المصباحُ

فی زُجَاجَةٍ ۖ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ

دُرِّیُّ یوقد من شجرٍ ۖ مَبْرُكَةٍ ۖ

زیتونہ لا شرقیۃ ولا غربیۃ

یكاد زیتہا یضئ و لو لم تمسسه نارٌ

نورہ علی نورہ یحیی اللہ لنورہ

من یشاء ۖ ویضرب اللہ الامثال

للناس ۖ واللہ بکل شیء علیم

کی طرف، تیل ایسا صاف و شفاف ہو کہ وہ

آگ کو چھوئے بغیر روشن ہو جائے۔ اللہ نور

علی نور ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنے نور کی

طرف ہدایت کرتا ہے۔ اللہ مثال لوگوں

کے لئے بیان کرتا ہے اور وہ ہر چیز کا جاننے

والا ہے۔

حضرت مجدد الف ثانی نے معانی اور الفاظ کو لباس اور بلوس سے تشبیہ دی ہے اور دونوں

کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے فرماتے ہیں۔

”قرآن کلام خداست جل سلطانہ کہ بہ لباسِ حرف و صوت در آورده بر پیغمبرِ اعلیٰ و علیٰ  
آلہ الصلوٰۃ والسلام منزل ساختہ و عباد را بہ آن امر و نہی فرمودہ چنانچہ کلامِ نفسی خود را  
بہ توسط کام و زبان در لباسِ حرف و صوت در آورده ظاہری سازیم و مقاصدِ خفیہ خود  
را در عرصہٴ ظہوری آریم ہم چنین حضرت حق سبحانہ کلامِ نفسی خود را بے توسط کام و زبان  
بہ قدرتِ کاملہ خود لباسِ حرف و صوت عطا فرمودہ بر عباد فرستادہ است و او امر و  
نواہی خفیہ خود را در ضمن حرف و صوت آورده بر منضہ جلوہ دادہ است۔

جو لوگ قرآن مجید کو صرف معانی کے اعتبار سے دھی مانتے ہیں اور الفاظ کی نسبت خدا کی  
طرف نہیں کرتے۔ ان کو غور کرنا چاہئے کہ قرآن مجید کی تصریحات سے قطع نظر یہ ایک بالکل واضح  
امر ہے کہ قلب میں محض معانی کے انوار کے کوئی معنی ہی نہیں جس طرح معانی کا اظہار بغیر الفاظ کے  
نہیں ہوتا۔ اسی طرح قلب میں ان کا ظہور اور پھر ان کا تشخص و تعین بھی الفاظ کے بغیر ناممکن ہے چنانچہ  
ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی تصنیف ”اسلام میں مذہبی خیال کی تعمیر نو“ (Reconstruction of  
religious thought in Islam) میں لکھتے ہیں۔

”جدید علم النفس نے حال میں ہی متصرفانہ شعور و کنیت کی حقیقت کی طرف توجہ کی ہے اس  
بلاد اسطہ شعور و آگہی کے ذریعہ ساک خدا کو اسی طرح جانتا ہے جس طرح ہم عام چیزوں کو دیکھ کر  
یہ شعور و احساس ناقابلِ تجزیہ ہے اور کسی خارجی وجود کے عکس پر تو کا نتیجہ ہے۔ اس شعور و  
احساس کی کنیت کسی دوسرے کے لئے بیان کرنی بھی مشکل ہے۔

ذوق این بادہ ندانی بخشد تا نابخشی

پیغمبر کا یہ احساسِ فہم و ادراک کا عنصر بھی رکھتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ پیغمبر کا  
یہ احساسِ خیال کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اس کے احساس کی خصوصیت ہی یہ ہے



کہ وہ الفاظ کا جامہ پہن کر زبانِ نبوت پر جاری ہوتا ہے۔ احساس دراصل ایک خارجی چیز (Outward Pushing) کا قلب پر وارد ہونا۔ اور خیال اُس کے اظہار (Outward Reporting) کا ذریعہ ہے۔ غیر فطری اور گنگا احساس اپنے مشاعرہ خیال کی صورت میں ادا کرتا ہے اور خیال الفاظ کا جامہ پہن کر ظاہر ہوتا ہے گویا یہ کتنا محض استعارہ نہیں ہے کہ خیال اور لفظ دونوں بیک وقت رحم احساس سے پیدا ہوتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ خیال الفاظ سے معرا نہیں ہوتا۔ اپنی ابتدا اور آفرینش کے لحاظ سے دونوں مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ گویا لفظ بھی علم ہے۔ مختصر یہ ہے کہ قرآن لفظاً و معنیاً کلام الہی ہے۔

روزمرہ کی زندگی میں دیکھئے آپ کسی اچھے اور بیباختہ شعر کو سنکر کہتے ہیں ”یہ تو الہامی شعر ہے“ اب بتائیے کہ کیا اس جملہ سے آپ کی مراد یہ ہوتی ہے کہ اس شعر کے صرف معانی الہامی ہیں؟ ہرگز نہیں! بلکہ حق یہ ہے کہ معانی کتنے ہی عمدہ اور بلند ہوں۔ اگر الفاظ کا جامہ اُن پر چست نہیں ہو تو آپ کبھی اُس شعر کو الہامی کہہ ہی نہیں سکتے۔

کیا کلام کے لیے نطق ضروری ہے | بعض نادان پوچھتے ہیں کہ اچھا خدا کلام کرتا ہے تو اُس کے لئے نطق بھی ہوگا۔ حالانکہ نطق اعصاب و عضلات کی مخصوص حرکت کا نام ہے۔ اور یہ حرکت ذاتِ بسیط و مجرد کے لیے نہیں ہو سکتی۔ ”جو اب یہ ہے کہ اول تو اس شبہ کا جواب پہلے ہی گزر چکا ہے یعنی یہ کہ ہم خدا کی کسی صفت کو اپنی صفت پر قیاس نہیں کر سکتے۔ جس طرح ہمارا ایمان ہے کہ خدا دیکھتا ہے اور سنتا ہے لیکن یہ نہیں معلوم کہ اُس کے دیکھنے اور سننے کی صورت اور حقیقت کیا ہے؟ اسی طرح ہم کو بہ طریقِ اذعان و یقین معلوم ہے کہ خدا کلام کرتا ہے۔ لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ اُس کلام کی نوعیت کیا ہے؟

علاوہ ازیں اس کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہئے کہ کلام کے لیے نطق کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ کیونکہ کسی کا کلام وہ ہے جس سے اُس کے مافی الضمیر کا اظہار ہو اور یہ اظہار جس طرح زبان کے ذریعہ ہوتا ہے۔ ہاتھ کے یا کسی اور عضو کے اشارہ سے اور اُس کے علاوہ مختلف طریقوں سے بھی ہوتا ہے۔ فرض کیجئے ایک شاعر اپنی زبان سے ایک حرف نہ کہے اور وہ پوری ایک غزل صفحہ قرطاس پر لکھ کر ہمیں دیدے تو کیا ہم اُس غزل کو اس بنا پر شاعر کا کلام نہیں کہیں گے کہ اُس نے اس غزل کے الفاظ و حروف کا نطق کیا ہی نہیں ہے۔

کون نہیں جانتا کہ فوجوں میں جھنڈیوں۔ شیٹوں اور اشاروں سے گفتگو کی جاتی ہے اور انھیں ذرائع سے خبریں پہنچائی جاتی ہیں۔ اسٹیشنوں پر بازاروں میں، اور ٹریفک کے موقعوں پر سبز اور سرخ روشنیوں سے الفاظ و حروف کا کام لیا جاتا ہے انسان جب تک الفاظ و حروف سے آشنا نہیں ہوا تھا وہ گفتگو کے وقت ہاتھ اور آنکھ کے اشاروں سے مافی الضمیر کا اظہار کرتا تھا۔ ظاہر ہے یہ تمام علامات و اشارات معانی پر دلالت کرنے کے باوصف غیر ملفوظ و غیر منطوق ہیں لیکن اگر ان معانی کو کسی دوسرے تک منتقل کیا جائے تو پھر یہ معانی الفاظ و حروف کا جامہ پہن لیں گے تاہم ان کی نسبت اس شخص کی ہی طرف ہوگی جس نے بولے بغیر کسی علامت کے ذریعہ آپ کو وہ معانی بتائے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ اور واضح مثال یہ ہے کہ تار گھر میں آپ نے دیکھا ہوگا تار بابو ایک آلہ جس کو انگریزی میں ڈمی (Dummy) کہتے ہیں۔ اُس کے پاس بیٹھ کر انگلیوں کی حرکت سے اس آلہ کو جنبش دیتا ہے اُس کی اس جنبش سے کسی دوسرے شہر میں تار وصول کرنے والا بابو محض گرگٹ گرگٹ کی آواز سنتا ہے اور تار کا تمام مضمون معلوم کر لیتا ہے پھر جب وہ اس مضمون کو صفحہ قرطاس پر منتقل کرتا ہے تو مسلسل ایک بامعنی عبارت یا جملہ بن جاتا ہے

ساتھ ہی یہ بھی دیکھئے کہ گرگٹ گرگٹ کی آواز کے ذریعہ تار کا مضمون صحیح صحیح معلوم کر لیتا تار وصول کرنے والے (Receiver) بابو کی لیاقت و قابلیت پر منحصر ہوتا ہے۔ اگر یہ قابل ہے تو وہ مضمون کا ایک ایک حرف ہی وصول نہیں کرتا بلکہ عبارت کا کما اور طویش تک صحیح صحیح وصول کر لیتا ہے۔ پس یہی حال انبیاء اور رسل کا ہے، ذات حق میں اور ان میں ایک خاص قسم کا معنوی تعلق ہونے کے باعث ان میں اس بات کی صلاحیت بدرجہ اتم ہوتی ہے کہ مبداء فیاض کی جانب سے جن معانی و مطالب کا فیضان ایک خاص طریقہ پر ان کے نفوسِ طاہرہ پہ ہو وہ انہیں پورے طور پر سمجھ لیں اور چونکہ کسی معنی کا دل میں خطوہ بغیر الفاظ کے نہیں ہوتا۔ اس لیے انبیاء کرام جب ان معانی کو سمجھتے ہیں تو اس حالت میں سمجھتے ہیں کہ وہ معانی و الفاظ کے ساتھ متکیف اور ان کے جامہ میں لمبوس ہوتے ہیں۔ معانی اور الفاظ میں ایسا گہرا تعلق ہے کہ ان میں زمانہ کے اعتبار سے کوئی تقدم و تاخر نہیں ہوتا بلکہ یہ کھنپڑتا ہے کہ جس آن معانی کا اقرار ہو رہا ہے۔ ٹھیک اسی آن میں الفاظ بھی منجانب اللہ نازل ہو رہے ہیں۔ اور ان الفاظ کا بلغم بھی وہی ہے جس نے معانی کا اقرار قلب میں کیا ہے۔ اب دیکھئے یہاں الفاظ اور معانی دونوں کلام الہی کی صورت میں نبی کے قلب پر نازل ہو رہے ہیں اور پھر پائے نطق درمیان میں نہیں ہے و لا غرابہ فیہ

زبان حال کی دست گویائی | استدلال کے لیے نہیں بلکہ آتماً بالحق جو متفلسف کلام کا بغیر نطق کے تصور بھی نہیں کر سکتے اس موقع پر ان سے یہ دریافت کرنا غالباً بے محل نہیں ہوگا کہ کیا آپ نے کبھی یہ نہیں سنا کہ بعض مرتبہ زبان حال سے دل کی بات ایسے بلغم پر ایہ میں بیان ہو جاتی ہے کہ زبان حال سے نہیں ہوتی عربی کا ایک شاعر کہتا ہے

و لقلب علی القلب  
و فی الناس من الناس  
و لیس حین یلقاہ  
س مقایس و اشباہ

و فی العین غسنی للمرء ۛ ان تنطق افواه

ایک اور شاعر نے اس سے بھی زیادہ واضح الفاظ میں کہا ہے، اور لطف یہ ہے کہ اس نے زبان  
چشم کی گویائی کو وحی سے تعبیر کیا ہے۔

ترمی علیہا عینی فتعرف وجہا ۛ تعرف عینی ما بہ الوحی یروح

ایک شاعر آنکھ کے ذریعہ کسی مافی الضمیر کو اپنے مخاطب پر ظاہر کر دینے کو آنکھ کا نطق بتاتا  
ہے۔

العین شیدی الذی فی نفس صلیہا ۛ من الجبۃ او بغض اذا سکانا

والعین تنطق والافواه صابئۃ ۛ حتی ترمی من ضمیر القلب بیانا

ترجمہ:- آنکھ، خواہ محبت ہو یا بغض بہر حال اس چیز کو ظاہر کر دیتی ہے جو کسی شخص کے دل میں

ہوتی ہے۔ اور آنکھ گویا ہوتی ہے در آنجا لیکہ منہ خاموش ہوتے ہیں۔ یہاں تک کہ آنکھ

دل کی چھپی ہوئی بات کو صاف صاف دیکھ لیتی ہے۔

کتب عقائد کا ایک مشہور عربی شعر ہے جو کلام نفسی کی بحث میں نقل کرتے ہیں

انّ الکلام لفی الفؤاد و انما ۛ یجّل اللسان علی الفؤاد و لیسلاً

ترجمہ:- کلام تو دراصل دل میں ہوتا ہے زبان تو صرف ظاہر کر دینے والی ہے۔

قرآن مجید میں خدا کی صفت کلام کا ذکر یہاں تک جو بحث تھی محض عقلی تھی۔ ضمناً کہیں کہیں مدعا کی تائید تقویت

لے ترجمہ:- اور دل جب دل سے ملتا ہے تو اس کے لئے ایک دوسری پر دلالت کرنیوالا ہوتا ہے لوگ آپس میں ایک دوسرے

کے مائل اور مشابہ ہوتے ہیں اور آنکھ اس طرح کلام کرتی ہے کہ منہ کو بولنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔

لے ترجمہ:- اس محبوبہ کی آنکھ میری آنکھ کو دیکھتی ہے اور اس کی وحی پہچان جاتی ہے پھر مجھ کو آنکھ اس وحی

کا جواب دیتی ہے تو میری آنکھ اسے پہچان جاتی ہے۔

کے لئے آیتوں کے حوالے آگئے ہیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید میں خدا کی صفت کلام کی نسبت کیا کچھ تصریحات ہیں۔ تاکہ آپ انہیں نتیجاتی عقلی پر منطبق کر سکیں۔

کلام صفت کمال ہے | حضرت موسیٰ کے واقعہ میں سامری کے پھڑے کا جو نقص بتایا گیا ہے اُس میں اس کا بھی ذکر ہے کہ وہ کلام نہیں کر سکتا تھا۔ ارشاد ہے۔

وَ اتَّخَذَ قَوْمُ مُوسَىٰ مِنْ بَدَايِهِمْ  
 حِيلَةً ۚ لَا يَكْتُمُهُمْ ۗ وَلَا يَهْدِيهِمْ  
 سَبِيلًا

موسیٰ کے بعد ان کی قوم نے اپنے زیوروں سے  
 ایک پھڑے کا ڈھرنایا جو گائے کی سی آواز  
 نکالتا تھا، کیا ان لوگوں نے یہ نہیں دیکھا کہ یہ  
 پھڑہ ان سے کلام کر سکتا ہے اور نہ کسی رستہ  
 کی طرف رہنمائی کر سکتا ہے۔

پھر اسی پھڑہ کی نسبت اسی سورۃ میں ارشاد ہے۔

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا  
 وَلَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا

کیا وہ لگ رہے ہیں دیکھتے کہ پھڑا ان کی کسی  
 بات کا جواب دے سکتا ہے اور نہ وہ ان کے  
 ضرر و نفع کا مالک ہے۔ (اعراف)

سامری پھڑے کو خدا بتاتا تھا۔ قرآن اس کی تردید کرتا ہے اور پھڑہ کی عدم الوہیت کی دلیل یہ بیان کرتا ہے کہ وہ تو کلام بھی نہیں کر سکتا تھا اس سے معلوم ہوا کہ خدا کے لئے مکمل ہونا ضروری ہے خدا کلام کرتا ہے | چنانچہ خدا نے متعدد مواقع پر قرآن میں اپنے کلام کرنے کا ذکر کیا ہے، حضرت موسیٰ کے واقعہ میں ذکر ہے۔

وَلَمَّا جَاءَ مُوسَىٰ لِمِيقَاتِنَا وَكَلَّمَهُ  
 رَبُّهُ

اور جب موسیٰ ہمارے مقررہ وقت پر حاضر فرمیں  
 کے لیے آیا۔ اور اُس کے رب نے اُن سے کلام کیا

پھر حضرت موسیٰ کو جو شرف ہم کلامی عطا فرمایا گیا تھا اس کا ذکر اس طرح ہے۔

يٰمُوسَىٰ اِنِّى اصْطَفَيْتَكَ عَلَى النَّاسِ اے موسیٰ میں نے تجھ کو اپنی پسندیدگی اور ہم کلامی  
بَدَسَلْتِى وَبِكَلَامِى سے لوگوں پر برگزیدگی بخشی۔

کسی کو خیال ہو سکتا تھا کہ ممکن ہے اللہ نے صحیح کلام نہ کیا ہو، اور کَلَّمَ کی اسناد اللہ  
کی طرف مجازاً ہو۔ اس شبہ کا ازالہ بھی کر دیا گیا۔ فرماتے ہیں۔

وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوسَىٰ تَطِيْمًا اور اللہ نے موسیٰ سے یقیناً کلام کیا ہے۔

زبان عربی کے رمز شناس جانتے ہیں کہ مصدر سے فعل کی تاکید بیان کرنا اس پر دلالت کرتا ہے  
کہ فاعل سے فعل کا صدور ضرور ہوا ہے۔

ان آیتوں کے علاوہ کئی آیتوں میں اہل جنت سے کلام کرنے کا۔ اور بے ایمان لوگوں کو  
کلام نہ کرنے کا بھی تذکرہ ہے مثلاً اہل جنت کے باب میں ہے۔

سَلَامٌ قَوْلًا مِّن رَّبِّ رَحِيْمٍ سلامتی ہو، یہ رب رحیم کی طرف سے کہا گیا ہو  
بے ایمانوں کے بارہ میں کہا گیا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ لَعِبْدِ اللّٰهِ جن لوگوں نے اللہ کے وعدہ اور اپنی قسموں کو  
وَاِيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَاصْحٰبٰتِ تَهْوٰى سِىِّئَةٍ مِّنْ بَيْنِ يَدٰى اُنْ كٰلِ  
لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ دَلٰٓئِلُ يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ اٰخِرَتِمْ مِّنْ كٰفِرِيْنَ كٰفِرِيْنَ كٰفِرِيْنَ كٰفِرِيْنَ كٰفِرِيْنَ  
دَلٰٓئِلُ يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ کلام کریگا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا۔

خدا اپنی شان کے مطابق کلام کرتا ہے | صفت کلام کے اثبات کے ساتھ ساتھ قرآن کے انداز بیان

سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے کلام کی حقیقت وہ نہیں ہو جو ہائے کلام کی ہو بلکہ اس کا کلام اس کی شان  
الوہیت کے مطابق ہوگا۔ اگرچہ قرآن نے اس مضمون کی تصریح نہیں کی لیکن اس نے مختلف چیزوں

کے لئے جو کلام کا لفظ بولا ہے اُس سے اس مدعا پر روشنی پڑتی ہے۔ قیامت کے دن انسان کے دست و پا اس کے اعمال و افعال پر جو شہادت دینگے اُن کے ذکر میں ہے۔

الْيَوْمَ نَخْتُمُ عَلَىٰ أَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَا أَعْيُنَهُمْ بِمَا لَمْ يَرْبُوا فَنَسُوا حَظًّا فَمَا لِلْكَافِرِينَ فِي الْعَذَابِ حِيلَةٌ

آج کے دن ہم اُن کے منہوں پر مہر لگا دینگے  
اور اُن کے ہاتھ ہم سے کلام کرینگے اور اُن کے

(تس) پر شہادت دینگے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کلام کرینگے اور پر شہادت دینگے۔ لیکن کس طرح؟ اسکی حقیقت نامعلوم ہے۔ اسی طرح کھالوں کے متعلق ارشاد ہے۔

وَقَالُوا اجْعَلْ لَنَا جُلُودًا نَّصَلُّهَا سُلُوفًا فَلَمْ يَكُنْ لَهُمَ جُلُودٌ عَلَيْهِمْ سُلُوفًا وَاللَّهُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ

علینا قالوا انطقنا الله الذي

الناطق كل شيء

دینگے کہ ہم کو اُس خدا نے گویا کر دیا ہے جس نے ہر چیز کو گویا کیا ہے۔

اب دیکھئے! اس آیت میں جلوہ کے لئے نطق ثابت کیا گیا ہے۔ لیکن اگر یہ پوچھا جائے کہ یہ نطق کس طرح کا ہے؟ تو اس کے جواب میں بجز اس کے اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ اس کی حقیقت کا علم صرف خدا کو ہی ہے۔ وہ سرگشتہ ظلمتِ حدوث و امکان انسان جس کا علم و ما اویتتم من العلم الاقلیدہ کے دائرہ میں محدود ہے، علم کی ان پہنائیوں تک رسائی کا دعویٰ کس طرح کر سکتا ہے۔ بس اس سے سمجھ لو کہ خدا کا کلام اس کی شان کے مطابق ہوگا، ہم اُس کی حقیقت کس طرح متعین کر سکتے ہیں۔

خدا نذا کرتا ہے | البتہ قرآن سے انہی بات اور ثابت ہے کہ خدا کے لئے نذا بھی پائی جاتی ہے  
حضرت موسیٰ کے واقعہ میں ہے۔

فلما اتاها لودى يا موسى اى  
جب موسى درخت کے پاس گئے تو ان کو ندا

انار بک (طہ) دی گئی کہ اے موسى! میں تمہارا رب ہوں

اس سے بھی واضح تر یہ ہے۔

ونادینا لا من جانب الطور  
اور ہم نے موسى کو طور کی دائیں جانب سے

الایمن (مریم) ندا دی۔

حضرت آدم کے واقعہ میں ہے

فلما اذا قال الشجر لا بدت لهما سوتھا  
جب آدم اور حوا نے درخت کو چمکا تو انکا ستر

وظفقا یخسفان علیہا من ورق  
ظاہر ہو گیا۔ اور یہ جنت کے پتوں سے اپنا تن

الجنة ونادا لھما ارجھا لھما انھکما  
ڈانکنے لگے اور ان کے رب نے انکو ندا دی

عن تلیکما الشجرة واقبل لکما  
کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے منع

ان الشیطن لکما عد ومبین  
نہیں کیا تھا اور نہیں کہا تھا کہ شیطان تم دونوں

کا کھلا ہوا دشمن ہے۔ (اعراف)

ایک جگہ ہے۔

ویوم یناد یھد ایں شرکائی  
اور جس دن خدا ان کو ندا دیگا کہ وہ کہاں

الذین کنتم تزعمون  
ہیں جن کو تم میرا شرک سمجھتے تھے۔

یہ اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد آیات ہیں جن میں خدا کے ندا دینے کا ذکر بہ صراحت

نہیں ہے اور چونکہ ندا کا تحقق بغیر صوتِ سموع کے نہیں ہوتا۔ اس لئے ان آیات سے ہی یہ بھی معلوم

ہوتا ہے کہ خدا کے لئے صوت ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری کی احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے

قرآن اور نطق ربانی لیکن یہ امر قابل غور ہے کہ جہاں تک قرآن مجید یا کسی اور آسمانی کتاب کے نزول



تعلق ہے اس سلسلہ میں خدا کی نڈیا یا صوت کا ذکر قرآن میں کہیں نہیں ہے بلکہ حضرت جبریل کو قلم کے ساتھ تشبیہ و تکراراً اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس طرح قلم کے ذریعہ کاتب کا پیغام مکتوب الیہ تک پہنچ جاتا ہے اور آواز نہیں ہوتی اسی طرح خدا کا پیغام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تک بغیر کسی نطق اور صوت کے پہنچا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ الَّذِي  
 عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ  
 يَعْلَمُ

آپ پڑھئے اور آپ کے رب اکرم نے قلم سے  
 کے ذریعہ تعلیم دی ہے اس نے انسان کو وہ  
 چیزیں بتائیں جنہیں وہ نہیں جانتا تھا۔

(۱۱۵) انسانوں سے کلام الہی کی صورتیں اس کے علاوہ کلام الہی کے سلسلہ میں قرآن نے بتایا ہے کہ خدا انسانوں سے کتنے مختلف طریقوں سے کلام کرتا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُكَلِّمَهُ اللَّهُ  
 إِلَّا وَجْهًا أَوْ مِنْ رَاءٍ حَاجِبٍ  
 يُرْسِلُ رَسُولًا فَيُوحِي بآذَنِهِ مَا  
 يَشَاءُ إِنَّهُ عَلَىٰ حَكِيمٍ عَالِمٍ

اور کسی بشر کی یہ مجال نہیں ہو کہ اللہ اس کو کلام  
 کرے گرد و حجاب کے ذریعہ سے یا پردہ کے آڑ سے  
 یا یہ کہ وہ کسی قاصد کو بھیجے جو اللہ کے حکم سے جو  
 کچھ وہ چاہے پہنچائے بے شبہ اللہ تعالیٰ

عام مفسرین جبریل کے لئے قلم کا استعارہ کرنے میں یہ حکمت بیان کرتے ہیں کہ اللہ اور آنحضرت کے درمیان جبریل کا واسطہ محض قلم کا ساتھ تھا جس طرح کتابت قلم سے ہوتی ہے لیکن اسکو کاتب نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو کچھ وحی پہنچتی تھی جبریل سے پہنچتی تھی لیکن انکی حیثیت قلم سے زیادہ نہیں تھی اور موحی صرف ذات خداوندی تھی۔ اس توجیہ کے خوب ہونے میں کلام نہیں لیکن مکن ہے اس میں یہ حکمت بھی ہو کہ قلم کے ذریعہ جو پیغام پہنچا ہے وہ نسبت پیغام زبانی کے عالمگیر اور ہر زمان و مکان میں یکساں کارگر ہوتا ہے۔

لہٰذا یہ آیت شکات قرآن میں سے ہے۔ اسکا یہ ہے کہ اس آیت میں کلام الہی کو (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اس آیت میں کلام الہی کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں۔ وحی کے ذریعہ سے کلام، پس

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مقسم قرار دے کر اس کی تین قسمیں بیان کی گئی ہیں اور اقسام تین چونکہ آپس میں تقسیم ہوتے ہیں اس لئے وہ ایک دوسرے کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے اس بنا پر خدا کا جو کلام بذریعہ ارسال رسل ہو گا

اس کو وحی نہیں کہہ سکتے حالانکہ قرآن مجید سب کا سب بواسطہ رسول (قاصد) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا ہے اور وہ وحی ہے۔ دوسرا اشکال یہ ہے کہ "ادنیٰ سبل" (سولاً فیوحی) باذنہ ما لیشاء" میں

فیوحی کو ارسال رسل پر متفرع کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وحی خود ارسال رسل کی ایک قسم ہے حالانکہ

آیت کے پہلے حصہ میں کلام الہی کو تین قسموں پر تقسیم کر کے وحی کو ارسال رسل کا قسم بتایا گیا ہے۔ تو اب قسم تیس سے کلام

قسم بننا لازم آگیا۔ وہو محال، حضرت الامام مولانا سید محمد انور شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے مشککات القرآن پر اپنی یادداشتوں

میں اس آیت کا بھی ذکر کیا ہے اور اس آیت کی تقریر اس طرح کی ہے کہ اشکال خود بخود رفع ہو جا رہا ہے۔ آپ

فرماتے ہیں "إلا وحیاً" اس سے مراد ہے بہ طریق وحی یعنی مصدر بیان نوع کے لئے ہے۔ اور چونکہ خدائے اس

وحی کی اسناد اپنی طرف کی ہے اور مابعد کی دو قسموں کو اس کا مقابل ٹھہرایا ہے اس لئے اس وحی سے مراد انوار

فی القلب ہے اور نفث فی الروح (دل میں پھونکنا یا ڈالنا) خواہ یہ بحالت بیداری ہو یا بحالت خواب، اس مخصوص

مراد کی وجہ سے وحی کی یہ قسم اپنے دونوں قسموں سے ممتاز ہو گئی، اور من و راء حجاب" اس سے مراد ہے

پس حجاب اس طرح کلام کرنا کہ متکلم نظر نہ آئے اور ایک غیبی آواز سنائی دے جیسا کہ حضرت موسیٰ نے سنا

یاشب معراج میں آنحضرت کو پیش آیا۔ ادنیٰ سبل" (سولاً فیوحی) اس میں ایجا روحی کرنے کی اسناد

خدا کی طرف نہیں بلکہ رسول کی طرف ہے۔ اس لئے مراد یہ ہوئی کہ اس صورت میں فرشتہ پنجم سے بالمشافہ گفتگو

کرتا ہے، اس نتیجے سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ یہ ایجا اول الذکر وحی متعارف ہے یعنی ایک وحی بلا واسطہ ہے اور

دوسری بواسطہ اور مقابلہ الشی لہفہ کا اعتراض وارد نہیں ہوتا۔

(مشککات القرآن ص ۲۳۲، ۲۳۳)

پر وہ کلام، اور کلام بذریعہ قاصد۔ ان تینوں قسموں میں سے کسی نہ کسی طریقہ کلام سے ہر پیغمبر کو شرفِ خطاب عطا فرمایا گیا اور حضرت موسیٰ کو کلام پس پر وہ کے شرف سے نوازا گیا کہ وہ اسی سینا کے ایک درخت سے انھوں نے صوت ربانی سنی۔ باقی رہیں دو صورتیں تو وہ تمام پیغمبروں کے لئے پائی گئی ہیں اور قرآن میں جگہ جگہ ان کا ذکر ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تینوں طریقہ کلام سے خطاب کے سرفراز کیا گیا تھا جس کی تفصیل آگے اپنے موقع پر آئے گی۔

## ملکہ نبوت اور وحی

یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ خدا اپنے خاص خاص بندوں سے مختلف طریقوں سے خطاب و کلام کرتا ہے، یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انبیاء بھی تو آخر ہمارے جیسے انسان ہی ہوتے ہیں۔ پھر ان میں ایسی کونسی خصوصیت ہے کہ خدا ان سے کلام کرتا ہے۔ اور وہ خدا کے کلام کو سمجھتے بھی ہیں لیکن ان کے علاوہ کوئی اور شخص شرفِ خطاب ایزدی سے بہرہ اندوز نہیں ہو سکتا؟

اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لئے سب سے پہلے ضروری ہے کہ آپ نبوت کی حقیقت کو تفصیلاً نہیں تو اجمالاً ہی سمجھ لیں۔ امام رازی نے مطالب العالمیہ میں امام غزالی نے معارج القدس میں حافظ ابن تیمیہ نے کتاب النبوات اور دوسری تصنیفات میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے حجتہ البالغہ میں اور مولانا محمد قاسم النانوتوی نے تقریر و پذیر میں اس عنوان کے ماتحت مستقلاً نہایت جامع اور سیر حاصل بخشیں کیں ہیں۔ ان سب کا اگر خلاصہ بھی نقل کیا جائے تو ایک مستقل کتاب بن جائے۔ ہم ذیل میں اب ان سب تقریروں کو سامنے رکھ کر نبوت کی حقیقت پر ایک اجمالی بحث کرتے ہیں۔ پہلے بطور مقدمہ چند باتوں کا جان لینا ضروری ہے۔

حکمت (۱) تمام فلاسفہ اس پر متفق ہیں کہ انسان کے انسان کامل ہونے کا دار و مدار اُس کے حکمت آب ہونے پر ہے۔ یہی وہ طفرائے امتیاز ہے جس کے باعث انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے اور یہی وہ شرف و عزت ہے جس کو قرآن مجید میں

ومن یؤت الحکمۃ فقد اوتی خیراً کثیراً اور جبکہ حکمت دیگی اسے بہت بڑی خیر دی گئی

فرما کر بیان کیا گیا ہے حکمت کے کہتے ہیں؛ اصولی اعتبار سے اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب جانتے اور مانتے ہیں کہ انسان میں اصلی قوتیں دو ہیں۔ ایک قوت نظری جس سے انسان اشیاء کے حقائق اور ان کے حسن و قبح کو معلوم کرتا ہے اور دوسری قوت عملی جس کے ذریعہ انسان کوئی عمل کرتا ہے ان دونوں قوتوں میں حاکم کون ہے اور محکوم کون۔ یا افضل و مفضول کس کو کہنا چاہئے؟ اس کو رہنے دیکھنے کہ ہمارے موضوع بحث سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ بہر حال یہ مسلم ہے کہ حکمت جس کو کہتے ہیں وہ انہیں دونوں قوتوں کے کمال کا نام ہے۔ کمال سے مراد یہ ہے کہ دونوں قوتیں نہایت صحیح اور تندرست ہوں یعنی اشیاء کے حقائق اور ان کے حسن و قبح کے متعلق قوت نظری کا فیصلہ بالکل واقعہ کے مطابق ہو اس میں کسی فریب یا کج نظری کو کوئی دخل نہ ہو۔ اسی طرح قوت عملی کے کمال کے معنی یہ ہیں کہ کسی فعل و عمل کے اخذ و ترک پر قوت عملی کی تحریک اس فعل کے حسن و قبح پر مبنی ہو۔ وہ ہم کو صرف اسی فعل کے کرنے پر براہِ نگینہ کرے جو حسن ہونے کے باعث حقیقتاً قابلِ خدمت ہو۔ اسی طرح وہ ان افعال سے بہ شدت روکے جو قبیح ہونے کی وجہ سے لائق ترک ہوں۔

مراتب کمال و نقص کا تفاوت | (۲) یہ ظاہر ہے کہ تمام انسانوں میں یہ دونوں قوتیں یکساں نہیں ہوتیں بلکہ ضعف اور قوت، زیادتی اور نقص کے اعتبار سے ان میں بے شمار مراتب مختلفہ پائے جاتے ہیں انہیں مراتب کی وجہ سے ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح شکل و صورت اور رنگ و روپ میں کوئی ایک شخص پورے طور پر کسی دوسرے شخص کے برابر یا مثل نہیں ہوتا۔ اسی طرح فضائل اخلاق اور ملکات نفسی میں بھی دو انسان ایک دوسرے کے مماثل و مساوی نہیں ہوتے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مرتبہ کمال و نقص میں ایک ایک درجہ ایسا ضرور رکھے گا کہ پھر اس کے اوپر (مرتبہ کمال میں) یا اس کے نیچے (مرتبہ نقص میں) کوئی اور درجہ نہیں ہوگا۔

استکمال و تکمیل | (۳) کسی انسان کی یہ دونوں قوتیں جب مکمل ہوتی ہیں تو ان کے کمال کا ایک مرتبہ

یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ انسان خود ہی کامل نہیں ہوتا بلکہ اُس کی قوتیں اپنے کمال میں کچھ ایسی مقناطیسی  
جاذبت اور کشش بھی رکھتی ہیں کہ وہ دوسروں کو متاثر کرتی ہیں اور دوسروں کی قوت نظری اور  
قوت عملی کو بھی کمال کی طرف مائل و راغب کر دیتی ہیں۔

ان مقدرات کو ذہن نشین کرنے کے بعد سمجھئے کہ جس کو نبی کہتے ہیں وہ وہی ہوتا ہے جس کی  
دونوں قوتیں، نظری اور عملی، انتہا درجہ کی کامل ہوتی ہیں اور وہ دوسروں کی ان قوتوں کو بھی کامل  
کر سکتا ہے۔

فکر و حدس | یہاں تک جو گفتگو تھی وہ نبوت کی عام حقیقت سے متعلق تھی لیکن چونکہ یہاں ہمارا مصلح  
نظر نبی کی استعداد و وحی سے بحث کرنا ہے جس کا تعلق قوت نظری سے ہے۔ اس لئے ہم یہاں  
قوت عملیہ کو نظر انداز کر کے قوت نظری کے متعلق ذرا تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ امر  
خود بخود واضح ہو جائے گا کہ صرف پیغمبر ہی کیوں کلام الہی سے شرف اندوز ہو سکتا ہے۔

تقریر بالا سے یہ تو معلوم ہی ہو چکا ہے کہ نبی کی قوت نظری تمام انسانوں سے زیادہ  
کامل اور افضل ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو دوسرے لفظوں میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے کہ  
فکر و اوراک کے اعتبار سے ایک انسان دوسرے انسان سے مختلف و متفاوت ہوتا ہے۔ کوئی  
غیبی ہوتا ہے اور کوئی نہیں، پھر عبادت اور ذہانت کے مراتب و مدارج بھی بشار ہیں۔ لیکن  
جانب نقصان و کمال میں دونوں مرتبے ایسے نکلتے ہیں کہ پھر ان کے اوپر پانچے کوئی اور مرتبہ  
نقصان و کمال نہیں پایا جاتا۔ ابن سینا نے اشارات میں لکھا ہے کہ ہم مرتبہ نقصان میں دیکھتے ہیں  
کہ بعض رگ عبادت و بلاوت طبع کے ایسے اسفل السافلین درجہ میں ہوتے ہیں کہ معمولی سے  
معمولی بات بھی آپ ان کو لاکھ مرتبہ سمجھائیں ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ جانب نقصان کے انتہائی مرتبہ  
میں ایک ایسے شخص کا موجود ہونا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اُس کے بالمقابل مرتبہ کمال میں بھی

ایک ایسا شخص ہوگا جو بغیر کسی تعلیم و تعلم کے اپنے نفس کے ادنیٰ التفات سے اُن مثل سے مثل مسائل حیات کو آسانی سمجھانے کے لئے عقودہ لائیکل ہونگے۔ فلاسفہ ایسے شخص کو صاحبِ فہم کہتے ہیں۔

علماء شریعت کی اصطلاح میں جن کو نبی کہتے ہیں اُس کی قوت فکر و حدس کا اندازہ فلاسفہ کے مندرجہ بالا بیان کی روشنی میں ہو سکتا ہے۔ چنانچہ امام غزالی اجیار العلوم میں عقل کے مراتب متفاوتہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وَمَنْ اَمَرَ تَفَاوُتِ النَّاسِ فِي  
 نَدْوِ الْغَرِيزَةِ فَكَانَ مُتَخَلِّعًا عَنْ رِبْقَةِ  
 الْعَقْلِ وَكَيْفِ سِنِّ تَفَاوُتِ  
 الْغَرِيزَةِ وَلَوْلَا هَا لَمَا اختلفتِ  
 فِي فِہمِ الْعُلُومِ وَلَمَا انقسموا اِلَى  
 بَلِيْدٍ لَا يَفِہِمُ بِالتَّفِہِمِ الْاَبَدِ تَعَبِ  
 طَوِيْلِ مَنِ الْعِلْمِ وَالِى ذِكْرِ يَفِہِمُ  
 بِادْنَى اَرْمِزٍ وَاشارَةِ وَالِى كَامِلِ  
 تَنْبَعِثُ مِنْ نَفْسِ حَقَائِقِ الْاُمُوْر  
 بِدُوْنِ التَّعْلِيْمِ كَمَا قَالَ تَعَالَى  
 "يَا ذُرِّيَّتَيَّ اِصْنَعِي وَاُولَئِكَ  
 نَارٌ نُوْرٌ عَلَى نُوْرٍ وَاُولَئِكَ  
 مِثْلُ الْاَنْبِيَاءِ اَوْ يَتَضَمَّنُ لَهُمْ

اور جو لوگ اس غریزہ (عقل) میں لوگوں کے  
 متفادات ہونے کا انکار کرتے ہیں انھوں نے گویا  
 عقل کی رسی اپنی گردن سے نکال پھینکی ہے  
 اور جبلا اس تفادات فی الغریزہ کا انکار کس  
 طرح کیا جاسکتا ہے؛ اگر یہ تفادات نہ ہوتا تو  
 لوگ علوم کے فہم میں مختلف نہ ہوتے اور نہ اُن کا  
 انقسام ہوتا ایسے بلید و غبی کی طرف جو تفہیم کے  
 بعد بھی نہیں سمجھتا۔ مگر اس وقت جبکہ معلم کو طویل  
 تعب برداشت کرنا پڑتا ہے اور ایسے ذکی کی  
 طرف جو ادنیٰ رمز اور اشارہ سے بات کو سمجھ  
 جاتے ہیں۔ اور ایسے کامل کی طرف جس کے  
 اپنے نفس سے بغیر تعلم کے حقائق اور پیدائش  
 جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے قریب ہو کہ زمینوں کا

فی بواطنہم امورًا غامضۃً من غیر  
تعلیم و سماع و تعبیر عن ذالک  
بالالہام (رج اص ۷۸)

تیل آگ چھوئے بغیر ہی روشن ہو جاتے۔ یہ  
نور علیٰ نوزہے اور ان کالوں کی مثال انبیاء  
کی ہی ہے۔ کیونکہ ان کے دلوں میں بغیر تعلیم و سماع  
کے ہی باریک باریک امور واضح ہو جاتے ہیں  
اور اس کمال کو الہام سے تعبیر کیا جاتا ہے

پھر آگے چل کر اس تفاوت فی العقل کو مثال سے اس طرح سمجھاتے ہیں

و انقسام الناس الی امن تینبہ  
من نفسہ و نفیم والی من لا نفیم  
الابتنیبہ و تعلیم والی من لا  
ینفعہ التعلیم ایضاً و لا التنبیہ  
کا انقسام الارض الی ما یجتمع  
فیہ الماء فیتفرج بنفسہ  
عیوناً والی ما یتحاج الی الحفر  
لیخرج الی القنوات والی ما لا  
ینفع فیہ الحفر و ہوا لیا بس  
و ذالک لاختلاف جوارہ الارض  
فی صفاتہا فلذا لک اختلاف  
النفوس فی غریزۃ العقل

اور لوگوں کا منقسم ہونا ایسے لوگوں کی طرف جو خود  
بخود متنبہ ہو جاتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں اور  
ان لوگوں کی طرف جو تنبیہ اور تعلیم سے ہی سمجھ  
سکتے ہیں اور ایسے لوگوں کی طرف جنکو تعلیم نفع  
بخشی ہے اور نہ تنبیہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا  
کہ زمین کئی قسم کی ہوتی ہے بعض زمینیں تو وہ  
ہوتی ہیں جن میں پانی جمع ہوتا رہتا ہے اور جب  
زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ خود چشموں کی شکل میں  
بہہ پڑتا ہے اور بعض زمینیں وہ ہوتی ہیں  
جنہیں کھودنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ پانی  
کو نہروں وغیرہ کی طرف منتقل کیا جائے اور بعض  
زمینیں جو خشک ہوتی ہیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں  
کھودنا بھی فائدہ نہیں دیتا اور لوگوں کی عقلوں

(رج اص ۷۸)

مختلف ہونا ایسا ہی ہے جیسا کہ زمین کے جوارہ میں اختلاف ہوتا ہے



اس کے علاوہ امام غزالی کے کتاب المنقذ من الضلال، اور احیاء العلوم میں یہ بھی لکھا ہے کہ نبوت مادرا عقل ایک مقام ادراک و احساس ہے جو انسان کے حواس ظاہرہ اور قوائے باطنہ کے تدریجی ارتقار کے بعد حاصل ہوتا ہے لیکن جس طرح تمیز و عقل کے مدرکات کے لیے حواس بیکاً ہیں اسی طرح اس درجہ کے مدرکات کے لیے عقل بے کار ہے۔ اگر کوئی شخص اس درجہ کا منکر ہے تو اس کا یہ انکار ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی بے عقل کا عقلی امور سے انکار کرنا۔ المنقذ من الضلال میں فرماتے ہیں۔

بلکہ نبوت پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ یہ اقرار کیا جائے کہ عقل سے بالاتر ایک مقام ہے جس میں آنکھ کھل جاتی ہے اور اُس کے ذریعہ سے خاص مدرکات کا ادراک کیا جاتا ہے اور عقل ان مدرکات کے ادراک سے ایسی ہی عاجز ہے جیسے کان رنگوں کے ادراک سے

بَلْ الْإِيمَانُ بِالنَّبُوءَةِ أَنْ لَقِيَ  
بِاثْبَاتٍ طُورِ دَرَارِ الْعَقْلِ تَنْفِجٍ  
فِيهِ عَيْنٌ يُدْرِكُ بِهَا مَدْرَكَاتُ  
خَاصَّةٌ وَعِلْمٌ مَعْرُوفٌ عَنْهَا  
كَعَرْوِ السَّمْعِ عَنِ ادْرَاكِ  
الْأَلْوَانِ لِحُجْمِ

اس بنا پر نبوت کا اصل ادعان ولقین امام صاحب کے نزدیک صرف اُس شخص کو ہی ہو سکتا ہے جس کو خود نبوت کا مقام حاصل ہو یا جو نفس قدسی رکھنے کے باعث مابعد الطبیعی حقائق کو معلوم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ چنانچہ اپنی حالت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

وَبِالْحِكْمَةِ مَنْ لَمْ يُرْزَقْ مِنْهُ شَيْئًا  
بِالذُّوقِ فَلَيْسَ يُدْرِكُ مِنْ حَقِيقَةِ  
النَّبُوءَةِ إِلَّا الْأَسْمَاءَ

کے اور کسی چیز کا ادراک ہی نہیں کر سکتے۔

ذوقِ اس بادہ ندانی بخدا تانچشی

فلاسفہ کی تعبیر کے مطابق ان اربابِ نفوس قدسیہ کا دل آئینہ کی طرح مجلی اور ند کی ہوتا ہے جس میں عقلِ فعال کی طرف سے جو تمام معقولات اور صورت معنویہ کا خزانہ ہے۔ حقائق کا انعکاس ہوتا رہتا ہے اور اس فیضان و تاثر کی وجہ سے وہ بڑی سے بڑی نظری چیزوں کا علم حاصل کر لیتی ہیں جو دوسروں کو بڑی مشق و مہارت کے بعد بھی حاصل نہیں ہوتا اور یہ علم شائبہ تردد و شک سے آلودہ ہونے کے باعث قطعی اور حتمی ہوتا ہے۔

ملکہ نبوت وہی ہے کسی نہیں | آئینہ کی مثال سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ملکہ نبوت ہر شخص کو حاصل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ یہ خاص مہبتِ خداوندی ہے جو کسی کسی کو عطا فرمائی جاتی ہے قرآن مجید میں ہے۔

اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ اپنا پیغمبر کس کو بنائے

آپ دیکھتے ہیں آفتاب جہاں تاب طلوع ہو کر کائناتِ عالم کے ذرہ ذرہ پر جلوہ پاش ہوتا ہے اور اُس کی شعاعیں در و دیوار مٹی پتھر، گھاس اور کوڑا کرکٹ ہر چیز پر پڑتی ہیں۔ لیکن جب یہی شعاعیں کسی آتشِ شیشہ پر پڑتی ہیں تو وہ اُس کو جگمگا دیتی ہیں، یہاں تک کہ خود اُس میں سے شعاعیں چھن چھن کر دوسری چیزوں پر جو اس کے بالمقابل ہوتی ہیں عکس ریز ہونے لگتی ہیں اسی طرح یقین کرو کہ وجودِ ابدی و سرمدی کا خورشیدِ حقیقت اپنی پوری تابانیوں کے ساتھ روشن ہے اور بلا امتیاز و شائبہ ہر چیز کو اپنی شعاعوں سے متفیض کر رہا ہے، لیکن یہ اپنی اپنی فطری و جبلی استعداد کا فرق ہے کہ ہر چیز اُس سے اپنی فطری صلاحیت کے مطابق ہی کسبِ فیض کر سکتی ہے۔ انبیاء کے نفوسِ قدسیہ اگر اس آفتابِ حقیقت کی نورانی شعاعوں کو جذب کر کے خود منور ہوتے ہیں اور دوسروں کو منور کر دیتے ہیں تو اس لئے کہ وہ آتشِ شیشہ کی طرح اس کی فطری استعداد رکھتے ہیں۔ اور اگر ہم ان انوار و تجلیات سے براہِ راست اکتسابِ نور نہیں کر سکتے تو اس کی وجہ

یہ ہے کہ ہمارے دل اور قواردر کہ اُس لوہے کی طرح ہیں جس کو جلائے پانے کی وجہ سے آئینہ کا ہمر ہونے کا حوصلہ نہیں ہو سکتا۔ الغرض

ہرچہ مت از قامتِ ناساز و بے اندام ہا  
ورنہ تشریف تو بہ بالائے کس شوارست

شہیدی نے بھی اُردو میں اسی مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے۔

عام ہیں اُسکے تراطاف شہیدی سب  
تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

یہی وہ عام فطرتِ انسانی سے مافوق باطنی استعداد ہوتی ہے جس کی وجہ سے انبیاء کے حواس عام انسانی حواس سے بہت زیادہ تیز اور اُن کا شعور و ادراک دوسرے لوگوں کے شعور و ادراک سے کہیں زیادہ بلند

اور اعلیٰ ہوتا ہے۔ اب وہ خدا سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اسطوانہ خانہ کے گریہ کی آواز سن سکتا ہے

کنکریوں کی بیتیج سے اُس کے کان آشنا ہوتے ہیں اور وہ مسافت اور مکان و زمان کی حدود و

قیود سے گذر کر اپنی آنکھ اور کان سے وہ سب کچھ دیکھ اور سن سکتا ہے جو دوسرے لوگ تو برتو حجاباً

نظر و سمع کی وجہ سے دیکھ اور سن نہیں سکتے۔ جویم اسرار ازل کے محرم راز حضرت ملا نادر رومی فرماتے ہیں

فلسفی منکر شود در فکر و ظن  
گو بر و سر ابران دیوار زن

نطق آب و نطق باد و نطق گل  
ہست محسوس حواس اہل دل

فلسفی کو منکرِ خانہ است  
از حواس انبسیار بیگانہ است

ایک اور نظریہ شیخ الاشراف اور بعض دوسرے صوفیاء و فلاسفہ اسلام کا ایک نظریہ یہ ہے کہ کائنات

ہستی تین عالموں کے مجموعہ کا نام ہے جن کو موالید ثلاثہ کہا جاتا ہے۔ یعنی جادات۔ نباتات اور حیوانات

ان ہی سے ہر عالم کی انتہا ایک ایسی نوع پر ہوتی ہے جس میں اپنے جنسی و نوعی خصائص کے ساتھ

دوسرے عالم کے بعض خصائص بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً جادات میں مونگا ایک ایسی چیز ہے

جس میں نباتات کی ایک خاصیت نشوونما پائی جاتی ہے۔ اب ہم نباتات کو دیکھتے ہیں تو اس میں

بھی ایک ترقی یافتہ نوع کجور کی نظر آتی ہے جس میں حیوانات کی طرح تذکیر و تانیث کا فرق و امتیاز ہوتا ہے اور ان کے مذکر و مونث کے پوند سے جس کو عربی میں تابیر کہتے ہیں کجوریں پیدا ہوتی ہیں ہندوستان میں ازبڈ خربوزہ یا پیتیا اور آم کی بعض قسموں کے متعلق بھی یہی بیان کیا جاتا ہے۔ پھر حیوانات کو دیکھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ حیوان کی انتہا ایک ایسی قسم مثلاً بن مانس پر ہوتی ہے جس میں بعض انسانی خصائص پائے جاتے ہیں۔ پس جس طرح خاص خاص جمادات میں نباتات کے اور خاص خاص نباتات میں حیوانات کے خصائص پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح نوع انسان میں بعض انسان ایسے پائے جاتے ہیں جن میں ملکوتی خصائص ہوتے ہیں۔ پھر ان ملکوتی خصائص رکھنے میں بھی فرق مراتب ہوتا ہے۔ اب ہم کہتے ہیں کہ وہ انسان جن میں تمام ملکوتی الصفات انسانوں سے بڑھ کر ملکوتی خصائص و صفات پائے جائیں شریعت و مذہب کی اصطلاح میں وہی نبی کہلاتا ہے اس امر خصوصیت کی وجہ سے نبی کے حواس باطنہ و ظاہرہ اس حواس میں ہی محدود نہیں ہوتے بلکہ ان کے علاوہ اس کو بعض ایسے حواس بھی عطا ہوتے ہیں جنکی جبر سے عالم مجردات کیساتھ قریبی اتصال ہوتا ہے اس اتصال کے باعث وہ خدا کا کلام سن سکتا اور سمجھ سکتا ہے اور اس کی آنکھیں ایسے جلووں سے روشن ہوتی ہیں جن کی دید کی تاب چشم ظاہر لاہی نہیں سکتی عارف باللہ مولانا رومی نے بھی ثنوی میں متعدد مواقع پر اس مضمون کو بیان کیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرماتے ہیں۔

پنج حس ہست جز این پنج حس	آن چو ز سرخ و این جہا چو مس
حس ابدال قوت ظلمت خورد	حس جاں از آفتابے می چرند
ہر کہ از حس خدا دید آیتے	در برحق داشت بہت طلعتے
گر بدیدے حس حیوان شاہ را	پس بدیدے گا و خسر اللہ را
گر نبودے حس دیگر مر ترا	جز حس حیوان ز بسرون ہوا

پس نبی آدم مکرم کے بڑے کے بحسن مشترک محسوس شدے  
جو لوگ مادیت کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں اور جن کی قوت فکر و نظر اس درجہ محدود  
ہے کہ وہ جسم اور مادہ کی حد بندوں سے گذر کر روح اور عالم مجردات کی باتوں کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ انکو تعجب  
ہو گا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یا کسی اور نبی کو بشر ہونے کے باوصف ایسا کونسا مقام پیش  
ہے جس میں آپ جو اس ظاہری سے بے تعلق ہو کر عالم یقین و مشاہدہ کی حقیقتوں کو علیٰ وجہ البصیرت  
وربافت کر سکیں، اور پھر انہیں محفوظ بھی کر لیں! لیکن یہ لوگ اگر ذرا وسعتِ نظر سے کام لے کر اپنے  
احوال گرد و پیش کا جائزہ لیں اور زندگی کے بعض نادر اور اہم واقعات کا عمقِ نظر سے مشاہدہ  
کریں تو انہیں اس دنیا میں ہی بعض ایسی مثالیں مل جائیں گی جن سے وحی و الہام، اور عالم مجردات  
سے تعلق کی نسبت ان کا استبعاد دور ہو سکتا ہو اور وہ یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ہائے جو اس ظاہرہ و  
باطنہ کے علاوہ بھی خاص خاص لوگوں میں بعض ایسی خاص قوتیں ہوتی ہیں جن کے ذریعہ وہ بالکل  
جو اس کی طرح اشیاء کو محسوس و معلوم کر سکتے ہیں۔

کم و بیش تین برس پہلے کی بات ہے، پنجاب کا ایک شخص خدابخش نامی وہلی آیا تھا۔ اور اس  
نے اپنے ایک عجیب و غریب باطنی کمال کا مظاہرہ نہی وہلی کے ایک مشہور و مہتمول سکھ کی کوٹھی  
پر کیا تھا۔ اس مظاہرہ میں وہلی کے چند عمائد کے ساتھ اخبار اسٹیٹسٹین کا نمائندہ بھی موجود تھا، نمائندہ  
نے اپنے چشم دید واقعہ کے متعلق جو رپورٹ اخبار میں درج کرائی تھی۔ اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔  
”خدابخش کی دونوں آنکھوں پر کپڑے کی ایک بہت موٹی پٹی باندھ دی گئی جس کے بعد کسی  
چیز کو دیکھنے کا امکان ہی نہ تھا، اسکے بعد اس سے ایک ایسے کمرہ سو گزرنے کے لئے کہا گیا جس میں جا بجا منتشر  
کرسیاں اور میزیں بغیر کسی ترتیب کے ڈال دی گئی تھیں، خدابخش اسی حالت میں ایک بالکل تندرست  
بینا انسان کی طرح کرسیوں سے ہتھا بچاتا کرہ سے باہر نکل گیا۔ اسکے بعد خدابخش کے کہنے پر اس کو اردو

اور انگریزی کے بعض اخبارات جن میں اخبار اسٹیٹسمن بھی تھا، پڑھنے کے لئے دیئے گئے اور مختلف جگہوں سے پڑھنے کے لئے کہا گیا۔ شخص موصوف نے انہیں بھی صاف صاف بغیر کسی دقت و دشواری کے اس طرح پڑھ دیا کہ گویا اس کی آنکھوں اور اخبارات کے درمیان کوئی چیز حائل ہی نہیں ہے کمال کا مظاہرہ کرنے کے بعد خدا بخش نے ایک تقریر کی جس میں اُس نے بتایا کہ دراصل انسان کے دماغ میں آگے کی جانب بعض ایسے بہت ہی چھوٹے چھوٹے غدود ہیں جن سے اگر مشق و مہارت ہم پونجائی جائے، آنکھوں کا کام لیا جاسکتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر آنکھیں بالکل ضائع ہو جائیں اور قوت بنیائی باقی نہ رہے تو انسان ان غدودوں کے ذریعہ چیزوں کو دیکھ سکتا اور کتاب غیر پڑھ سکتا ہے۔ تقریر کے آخر میں خدا بخش نے کہا کہ میں نے سالہائے دراز کی مشق کے بعد یہ کمال حاصل کیا ہے۔ لیکن میں اب بھی اس پر قانع نہیں ہوں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھ کو اس قوت میں ابھی اور اضافہ کرنا ہے۔“

بعض واقعات ایسے بھی نظر سے گذرتے ہیں کہ انتہائی حیرت انگیز ہوتے ہیں۔ آدمی ان کے مشاہدہ کرتا ہے، لیکن کوئی عقلی یا منطقی تعلیل و توجیہ نہیں کر سکتا۔ مولانا محمد حفظ الرحمن صاحب سیوہارومی رفیق اعلیٰ ندوۃ المصنفین سانپ کے کاٹے کا ایک کامیاب عمل جانتے ہیں جس کا ذخیرہ میں نے اپنے اکابر و احباب کے ساتھ متعدد بار یعنی مشاہدہ کیا ہے۔ اس عمل کے لئے خود مارگرند کا مولانا موصوف کے سامنے موجود ہونا شرط نہیں ہے وہ خواہ کتنے ہی فاصلہ پر ہو کوئی مضائقہ نہیں۔ مولانا کو جو شخص اس واقعہ کی اطلاع دے گا وہ اسے فوراً تھوڑا پانی کچھ پڑھ کے اور دم کر کے پلائینگے۔ خدا کی شان، ادھر پانی کا گھونٹ اس مجنبر کے حلق سے نیچے اترے گا اور ادھر مارگرند سے زہر کا اثر کم ہونے لگے گا یہاں تک کہ تھوڑی دیر کے بعد بالکل جا رہے گا۔

اب ان واقعات پر غور کرو، اور بتاؤ کہ وہ لوگ جنہوں نے اپنی آنکھ سے ان کا مشاہدہ

کیا ہے کیا وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ان کو درست ماننے میں تامل کرینگے؟ ہرگز نہیں، تو پھر وہ کوئی ان واقعات و حقائق کی منطقی و عقلی توجیہ و تاویل بھی کر سکتے ہیں؟ بالکل نہیں۔ بلکہ دیکھنے والوں کو اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ بعض بعض انسانوں میں غیر معمولی ذہانت و ذکاوت پائی جاتی ہے۔ جس کی وجہ سے ان سے ایسے عجیب و غریب اور محیر العقول کارنامے سرزد ہوتے ہیں جن کو دیکھ کر ہم فرط حیرت و استعجاب سے انگشت بندہاں تو ہو سکتے ہیں مگر اس کو سمجھ نہیں سکتے۔ اسی طرح مارگرز پرگی کے عمل کو دیکھ کر اس بات کا تو یقین ہو جاتا ہے کہ دواؤں اور جڑی بوٹیوں کی طرح بعض الفاظ و کلمات میں بھی ایسا اثر ہوتا ہے کہ وہ زہر کا اثر آرا دیتے ہیں لیکن یہ کیونکر؟ اور کس طرح؟ اور انہیں الفاظ کی خصوصیت کیوں ہے؟ دوسرے لفظوں میں یہ اثر کیوں نہیں پایا جاتا؟ اور اچھا لفظوں میں تریاتی اثر ہے تو ہوا کرے آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ ان الفاظ کا دم کیا ہوا پانی پتیا ہے ایک بالکل غیر متعلق شخص جس نے آکر خبر دی ہے اور اچھا ہو جاتا ہے مارگرز یہاں اور اس طرح کے متعدد سوالات ہیں جن کا کوئی حل نظر نہیں آتا، اور انسان کے لیے بجز اس کے کوئی اور چارہ کار نہیں رہتا کہ وہ اپنی عقل و فہم کی نارسائی کا اقرار کرے۔ اور جو کچھ دیکھ رہا ہے۔ یا جس کو معتبر اور سچے راویوں سے سنا ہو اس کے ہونے کا یقین کرے۔ کتنی ہی عجیب و غریب خبریں ہیں جن کو آپ روزانہ اخباروں اور رسالوں میں پڑھتے ہیں اور ان کو محض اس بنا پر سچ مان لیتے ہیں کہ کسی معتبر اخبار کے نامہ نگار نے انکو بیان کیا ہے۔ یا چند امریکہ اور یورپ کے ڈاکٹروں نے ان کا ذاتی طور پر تجربہ کیا ہے۔

نظر کو ذرا وسیع کیجئے تو آپ دیکھیں گے کہ صفات و خصائص کا یہ فرق و امتیاز انسانوں تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ اتحاد جنسی و نوعی کے باوجود ایک نوع کے مختلف افراد میں ہی بعض انفرادی خصوصیات کے باعث اتنا عظیم الشان فرق پایا جاتا ہے کہ ان پر مختلف انواع سے تعلق رکھنے کا شبہ ہوتا ہے۔ مٹی اور پتھر۔ اور عمل و یا قوت سب جمادات ہیں۔ مگر ایک تاج سلطانی اور قبائے شاہی

کی زینت بنتا ہے اور دوسرا کم ارز ہونے کی وجہ سے انسانوں اور چوپاؤں کے قدموں کو ٹھکرایا جاتا ہے۔ پھر لعل اور یا قوت بھی سب ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ بعض لعل ایسے ہوتے ہیں کہ میں ہر بلکہ بے بہا ہونے کے باعث بڑی سے بڑی سلطنت کے خزانہ کے لئے سرمایہ مخزن بنا دیتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ ایسے لعل گنتی میں دو تین سے زیادہ نہیں ہوتے اور ان کے بالمقابل دوسرے لعل ایسے ہوتے ہیں جن کو صورت و شکل اور رنگ میں یکساں ہونے کے باوجود ہر معمول اور صاحب ثروت انسان کی جیب خرید سکتی ہے۔ خوب اچھی طرح غور کرو، لعل و عقیق اور زمرد وغیرہ کیا ہیں پتھر ہی تو ہیں مگر پھر یہ کیا ہے کہ ایک پتھر بچھری رہا۔ دوسرے پتھر کو آفتاب کی شعاعوں نے اپنے مسلسل عمل تربیت سے لعل و زخماں اور یا قوت بنا دیا حالانکہ آفتاب کی شعاعیں دونوں پر یکساں ہی پڑتی ہیں۔ جس کو تم آئینہ کہتے ہو کیا اس کی حقیقت لوہے سے کچھ مختلف ہے؛ پھر اس کو کیا وجہ ہے کہ صنّاع کے دست ہمارے لوہے کے ایک ٹکڑے کو صاف و شفاف روشن آئینہ بنا دیا۔ جو سورج کی شعاعوں کو اپنے سینہ میں جذب کر کے اپنے مقابل کی چیز پر عکس نکلن ہو جاتا ہے اور اس کے برعکس دوسرا لوہا وہی لوہا رہا جو دست آہنگ سے آگ کی بھٹی میں جلتا ہے اور پھر سوہان پر تھوڑے کی ضرب کھاتا ہے۔ پھول پھول سب برابر ہیں، لیکن عجیب بات ہے کہ ایک پھول اپنی جاں نواز خوشبو سے قلب و دماغ میں عطر کی لہریں دوڑا دیتا ہے اور اس بنا پر کسی کا کل عنبر آگین کی زینت یا کسی کی دستار عورت و انقار کی رونق بنتا ہے۔ اور دوسرے پھول اس سے کم یا بالکل خوشبو نہ رکھنے کے باعث جس ٹہنی پر اپنی آنکھ کھولتے ہیں، بالآخر اسی پر ہاؤ خزاں کا جھونکے کی تاب نہ لا کر فنا ہو جاتے ہیں۔ یہ سب چیزیں تو خیر پھر بھی جو اہر یعنی قائم بالذات ہیں الفاظ تو اعراض ہی ہیں، آپ نے سانپ کے عمل کا حال پڑھ کر اندازہ کر لیا ہو گا کہ خود ان میں بھی حقیقت عفو طبیعت میں برابر ہونے کے باوجود کتنا عظیم الشان فرق و امتیاز ہوتا ہے۔



پس جب آپ عالم ہست و بود کی متحد النوع اشیا میں صفات و خصائص انفرادی کے باعث  
 اتنا اختلاف پاتے ہیں تو پھر اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انسانوں میں ایک انسان اپنے غیر  
 معمولی قومی باطنیہ یا کسی ایک خاص قوت کی زیادتی کی وجہ سے عام انسانوں کے برخلاف خدا سے  
 شرف ہم کلامی حاصل کرے۔ جس طرح سالہاے دراز کے بعد آفتاب کا فیض اثر ایک معمولی سے پتھر  
 کو لعل و عقیق کی شکل میں تبدیل کر کے اسے کچھ سے کچھ بنا دیتا ہے۔ اسی طرح یقین کر و خورشید حقیقت  
 کے انوار و تجلیات جب اپنے مخصوص فیضان و اثر کے لیے کسی عوش نصیب انسان کو چن لیتے ہیں  
 تو پھر وہ دنیا میں نبی بن کر ظاہر ہوتا ہے اور اُس سے ایسے معجزے صادر ہوتے ہیں جن کو دوسرے  
 لوگ نہیں کر سکتے۔ اور جس طرح لعل و عقیق روز روز نہیں پیدا ہوتے۔ اسی طرح انبیاء کرام بھی  
 کبھی کبھی مبعوث ہوتے رہتے ہیں۔

سالہا باید کہ تا یک سنگ اصلی ز آفتاب لعل باشد در بدخشاں یا عقیق اندرین  
 اور اب چونکہ ہمارے اعتقاد میں معدن ہستی کا وہ "کوہ نور" ہیرا جو یوم الست سے ذات احدیت  
 کے آفتاب عالم تاب کی آغوش مشیت میں تربیت پارتھا۔ اور جس کی آمد نمود کے انتظار میں  
 کائنات عالم کا ذرہ ذرہ شب و روز کی..... ایک ایک ساعت بڑی بے چینی  
 اور اضطراب سے گن رہا تھا، اس جہان آب و گل میں جلوہ فروز ہو کر دنیائے اخلاق و آئینہ  
 کے گوشہ گوشہ اور چہ چہ کو منور کر چکا اس لئے اب آئینہ اس نوع کا کوئی گوہر گراں مایہ (نبی)  
 دنیا میں نہیں آئے گا۔ البتہ ہاں اس سے کم درجہ کے جوہر ہر زمانہ میں موجود رہیں گے اور اُس  
 ہیرے کی قائم مقامی کا فرض انجام دیتے رہیں گے۔

نبی کی بشریت یہاں تک نہیں کی اُس قوت کا ذکر تھا جس کے ذریعہ وہ خدا کا کلام سن سکتا اور  
 سمجھ سکتا ہے۔ اب ہم نبی کی پیغمبرانہ حیثیت پر ایک دوسرے پہلو سے بحث کرتے ہیں۔

چونکہ نبی اللہ اور اُس کے بندوں کے درمیان خدمتِ سفارت و رسالت انجام دینے کے لیے آتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ اس میں ملکہ نبوت اور استعدادِ وحی کے ساتھ بشریت بھی پائے جائے، تاکہ وہ ملکہ نبوت کے ذریعہ خدا کا کلام سنے اور بشر ہونے کی وجہ سے عام انسانوں تک اُس پیغام و کلام کو پہنچا سکے اور اپنے عمل و قول سے اُس کی تشریح و تفہیم بھی کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن میں ارشاد ہے۔

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ مَلَكًا لَجَلْنَاكَ رَجُلًا ۚ  
اور اگر ہم فرشتہ کو نمبر بناتے تو اسے بھی آدمی

رہتا  
کی ہی شکل میں بھیجتے

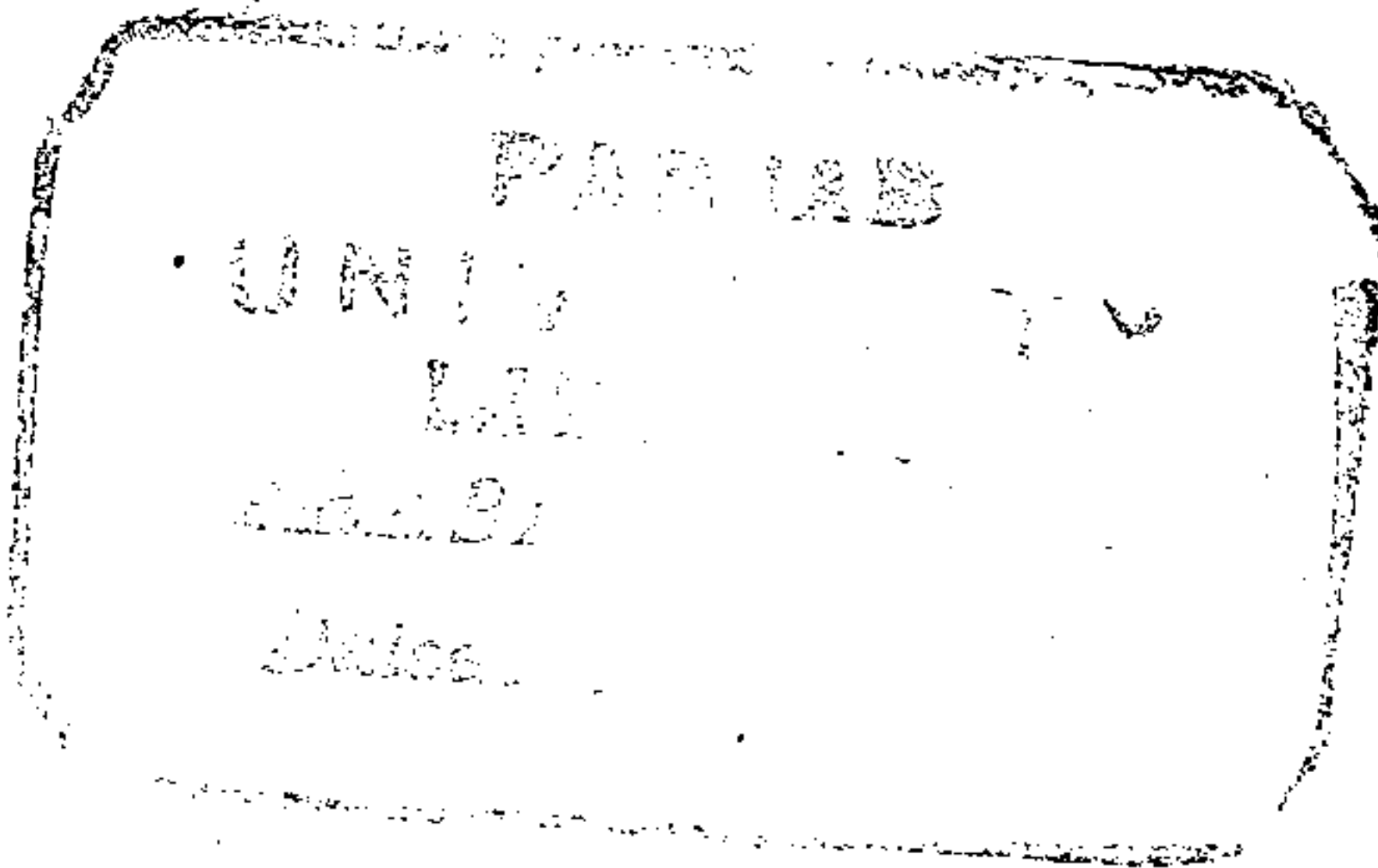
قاضی بیضاوی نے اس مسئلہ کی توضیح ایک نہایت عمدہ مثال سے کی ہے۔ آیت ”وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً“ کی تفسیر کے ذیل میں لکھتے ہیں۔

الامر می اَنَّ الْاَنْبِیَاءَ لِمَا فَاقَتْ  
کیا تم نہیں دیکھتے کہ چونکہ انبیاء کی توت فائق اور  
قُوَّتُهُمْ وَاسْتَعْلَتْ قُرْبُهُمْ بِحِیْثُ  
ان کی طبیعت اس درجہ روشن ہوتی ہو کہ گریا  
یَكَادُ زُرِّيْهَا لِيَضُّ وَ لَوْلَمْ تَسْنُ  
زیتون کا تیل آگ چھو کے بغیر خود بخود روشن  
نَارٌ اُرْسِلَ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَمِنْ مِّنْهُمْ  
ہے اس لئے خدا ان کے پاس فرشتے بھیجا ہے  
اَعْلٰی رُبَّةً كَلِمَةً بَلَا وَاِسْطَةً كَمَا كَلَّمَ  
اور جو زیادہ اونچے مرتبے والے ہوتے ہیں ان  
مُوسٰی عَلَیْهِ السَّلَامُ فِی الْمِیْقَاتِ  
سے جو اسطہ کلام کرتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ سے  
وَمُحَمَّدًا صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ لِمِیْقَةِ الْمَعْرَاجِ  
میقات میں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے شبِ  
وَنَظِیْرُ ذٰلِكَ فِی الطَّبِیْعَةِ اِنَّ الْعَظْمَ  
معراج میں کیا، طبیعیات میں اس کی نظیر یہ ہے  
لَمَّا عَجَزَ عَنْ قَبُوْلِ الْغَدَاءِ مِنَ اللّٰحْمِ  
کہ چونکہ تباعد کی وجہ سے ہڈی گوشت سے غذا  
لَمَّا بَيْنَهَا مِنَ التَّبَاعِدِ حَبْلِ الْبَارِیْ  
قبول نہیں کر سکتی اس لئے اللہ نے اپنی حکمت

تعالیٰ بحکمہ بینہا العضوف آلمنا سے ان دونوں دگوشت اور ہڈی کے درمیان  
 لہا لیاخذ من ہذا و لعی ذالک چھنی ہڈی پیدا کر دی جو دونوں سے مناسبت  
 رکھتی ہے تاکہ وہ غذا اس سے لے اور اسکوٹے

غرض یہ ہے کہ انبیاء کرام میں جہانیت اور روحانیت کا ایسا پاکیزہ امتزاج ہوتا ہے کہ  
 ایک طرف وہ بشر ہوتے ہیں اور دوسری جانب ان کی رسائی خطیرۃ القدس کے اُس مقام طیبیل  
 و عظیم تک ہوتی ہے جہاں جانے کا حوصلہ جبریل امین کو بھی نہیں ہوتا۔

اگر یک سروے برتر پریم فروغ تجلی بسوزد پریم  
 اس بنا پر صرف انبیاء ہی اللہ اور اُس کے بندوں کے درمیان سفارت و رسالت کی خدا  
 انجام دے سکتے ہیں۔ عام انسانوں کی طرح فرشتے بھی اس خدمت کو ادا کرنے کے قابل نہیں ہیں۔



## وحی اور بین لورپ

اہل مغرب تمام مذہبی قوموں کی طرح سولہویں صدی تک وحی کے قائل رہے۔ کیونکہ ان کی کتابیں انبیاء کے حالات و واقعات سے پڑتھیں جب سائنس کا دور شروع ہوا اور روحانیات سے ہٹ کر لوگوں کی توجہ مادیات کی طرف زیادہ ہو گئی، تو پھر فلسفہ مغرب نے اعلان کیا کہ وحی کا مسئلہ بھی ان پرانے خرافات میں سے ہے جو جہالت و نادانی اور وہم پرستی کے باعث انسانوں کے قلب و دماغ پر اب تک مسلط رہے ہیں۔ اس فلسفہ نے مابعد الطبعی حقائق کے انکار میں اس درجہ غلو کیا کہ سرے سے خدا اور روح کا ہی انکار کر دیا۔ اس سلسلہ میں وحی کی نسبت کہا گیا کہ یہ یا تو نبوت کا دعویٰ کرنے والوں کی اختراع ہے جو انھوں نے لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف مائل و راغب کرنے کے لئے اختیار کر لی ہے اور یا کسی قسم کا ہڈیان ہے جو بعض اعصاب کے مریضوں کو لاحق ہو جاتا ہے اس بنا پر ان کو بعض چیزوں کی صورتیں متشکل نظر آتی ہیں۔ حالانکہ حقیقت میں ان کی کوئی اصلیت نہیں ہوتی۔

فلسفہ یورپ نے وحی اور دوسری مابعد الطبعی چیزوں کی نسبت اپنے اس نظریہ کا اس زور و شور سے پروپیگنڈا کیا کہ یہ نظریہ فلسفہ کا ایک مستقل عقیدہ بن گیا اور ہر وہ شخص جو اپنے آپ کو عالم یا تعلیم یافتہ کہلا نا چاہتا تھا۔ اس کے لئے اس نظریہ کا قائل ہونا ضروری ہو گیا۔

لیکن ۱۸۴۶ء میں امریکہ میں وجود روح کے آثار و علامات نظر آئے جنھوں نے امریکہ سے گذر کر تمام یورپ کے خیالات میں توجہ پیدا کر دیا اور لوگوں کو ایسے عالم روحانی کے وجود کا اقرار

کرنا پڑا جس میں بڑی بڑی عقلیں اور روشن افکار آباد ہیں تو اب مسائل روحانیہ میں بحث و فکر کا نقطہ نظر بھی بدل گیا۔ اور وحی کا مسئلہ از سر نو زمرہ ہو گیا۔ علماء کے اس مسئلہ پر پھر بحث شروع کر دی لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان کی یہ بحث کسی مذہبی جذبہ پر نہیں بلکہ علم تجربی کے قواعد پر قائم تھی۔ اس بنا پر ہمیں تعجب نہ کرنا چاہئے، اگر وہ وحی کے باب میں ان نتائج و افکار تک نہیں پہنچ سکے جو علماء اسلام کے نزدیک مسلم ہیں۔ تاہم علماء مغرب کی تحقیق و تفتیش اور اس کے نتائج و استنباطات سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ وحی کو ہدیان محض، یا وہم و گمان سمجھتے تھے آخر کار ان کو بھی اُسکی واقعیت و صداقت کا اقرار کرنا پڑا۔ ہم صرف یہی فرق دکھانے کے لئے ذیل میں علماء مغرب کے افکار و نظریات مختصراً قلمبند کرتے ہیں۔ لیکن ہے اس سے منکرین وحی کو کچھ تمنہ ہو اور وہ اپنے اصرار پر نظر ثانی کرنے کی زحمت گوارا کریں۔

مجلس تحقیق | یورپ میں روح اور اس کے اثوات کی تحقیق کی طرف بعض علماء کو توجہ ہوئی اور انہوں نے اپنے نتائج فکر شائع کئے تو تمام مضامین ایک آگ سی لگ گئی۔ بمقام لندن ۱۸۸۲ء میں ایک کمیٹی بنی جس کا مقصد نفس اور اس کے تعلقات پر بحث کرنا اور ان کی تحقیق و جستجو کرنا تھا۔ اس کمیٹی میں جو علماء و اساتذہ شریک تھے ان میں قابل ذکر اور نمایاں تریہ حضرات تھے۔

(۱) پروفیسر جیک کیمبرج یونیورسٹی صدر کمیٹی، انگلستان کا مشہور عالم طبیعیات

(۲) پروفیسر سیراویل فرودگ عالم طبیعیات کا ماہر خصوصی

(۳) سر ولیم کرڈس انگلستان کا مشہور عالم کیمسٹری

(۴) پروفیسر فریڈرک مائرس کیمبرج یونیورسٹی

(۵) پروفیسر ہڈسن

(۶) پروفیسر ولیم جمیس ہر فورڈ یونیورسٹی امریکہ

(۶) پروفیسر بلیز لوب کو لیبیا یونیورسٹی

(۸) کامیل فلامریون فرانس کا ماہر مشہور فلکیات و ریاضیات

ان کے علاوہ یورپ کے مشہور علماء و گارنے، باریٹ اور بوڈو مور بھی اس کمیٹی میں شریک تھے۔ یہ کمیٹی تقریباً تیس سال تک قائم رہی۔ اس مدت میں اُس نے ہزاروں روحانی واقعات و حوادث کی تحقیق کی اور نفس انسانی اُس کے قوی اور قوتِ ادراک سے متعلق بار بار تجربے کئے جو چالیس ضخیم جلدوں میں مدون و محفوظ ہیں۔ اس کمیٹی نے اپنے نتائج فکر کی اشاعت کی تو انہوں نے ثابت کیا کہ انسان کے لئے ایک اور شخصیت بھی ہے۔ یعنی ہم اپنی موجودہ زندگی میں زندہ ہیں اور ادراک کرتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ ادراک اُن تمام روحانی قوتوں کی وجہ سے نہیں ہوتا جو ہمارے اندر موجود ہیں بلکہ اُن روحانی قوتوں کے کسی ایک جز سے ہوتا ہے جس کا اثر جو اس جسم کے افعال کے ذریعہ ظاہر ہوتا رہتا ہے لیکن جو زندگی کہ ہم کو جو اس بنشتے ہیں، اس سے بھی کہیں زیادہ بڑھ کر ایک اور زندگی ہے جس کی عظمت و جلالت کی کوئی نشانی اُس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک کہ ہماری یہ ظاہری شخصیت نیند یا کسی اور ذریعہ سے معطل نہ ہو جائے؛ چنانچہ ہم نے اُن لوگوں پر جن کو متناطسی نیند کے ذریعہ سلاویا گیا تھا۔ تجربہ کر کے دیکھا کہ سونے والے کو روحانی زندگی کی دولت فراوان حاصل ہوتی ہے اور وہ اس عالم میں اپنے جو اس ظاہری کے علاوہ کسی اور حاسہ کے ذریعہ دیکھتا اور سنتا ہے۔ بےید چیزوں کی خبریں دیتا ہے اور اس وقت اُس کی قوتِ تعقل و ادراک پورے طور پر بیدار ہو کر اپنا کام کرتی رہتی ہے۔

کمیٹی کے نزدیک یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی کہ انسان کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور شخصیت ہے جو پہلی شخصیت سے کہیں زیادہ اعلیٰ اور ارفع ہے۔ ان علماء نے یہ بھی معلوم کیا کہ یہی وہ اعلیٰ شخصیت ہے جس کے ذریعہ رحم میں جسم کا تکون ہوتا ہے اور جگر، قلب، اور معدہ وغیرہ

اعضا جن پر انسان کے ارادہ کو کوئی دسترس حاصل نہیں ہے اُن کی حرکت بھی اسی اعلیٰ شخصیت کی وجہ سے ہوتی ہے بلکہ حق یہ ہے کہ انسان کا انسان ہونا اسی شخصیت پر مبنی ہے۔ اُس شخصیت ظاہرہ پر نہیں جس کا قیام جو اس خمسہ ظاہرہ کے ساتھ ہے اور یہی وہ شخصیت ہے جو جسم کے کثیف پردوں کے درمیان سے عمدہ عمدہ خیالات پیدا کرتی ہے۔ الہاماتِ طیبہ کا تعلق بھی اسی سے ہے اور یہی وہ قوت ہے جو انبیاء کے قلب میں اُن چیزوں کا اتقار کرتی ہے جن کو اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی وحی کہتے ہیں، پھر کبھی یہی وحی مجسم ہو کر نظر آتی ہے تو اس کو اللہ کے فرشتے کہتے ہیں جو آسمان سے نازل ہوتے ہیں۔

۱۴ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب پھر کہتا ہوں کہ علماء مغرب وحی کی جو حقیقت بیان کرتے ہیں وہ بعینہ وہ نہیں ہے جو علماء اسلام نے بیان کی ہے، لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ روح اور وحی والہام کے تصور کو کھلی ہوئی گمراہی اور اُن کے اعتقاد کو وہم پرستی کہنے والے یورپ کے علماء محققین بھی عرصہ دراز کے غور و خوض کے بعد کس طرح ان چیزوں کی واقعیت کے قائل ہو گئے۔ اور اگرچہ انہوں نے ان چیزوں کی اصلی حقیقت کے بیان کرنے میں اسلامی نقطہ نظر سے چند در چند غلطیاں کی ہیں لیکن پھر بھی حیرت کی بات ہے کہ ان علماء نے اس سلسلہ میں جو کچھ کہا ہے وہ بعض علماء اسلام کے بیانات سے کچھ زیادہ دور نہیں ہے اور جو تقریر نقل کی گئی ہے ایک طرف تم اسے پڑھو۔ اور دوسری جانب امام غزالی کی تقریر ذیل پر غور کرو جو انہوں نے وجود کی تین قسمیں وجود حسی، وجود عقلی اور وجود خیالی بیان کرنے کے بعد آخری قسم وجود خیالی کی تشریح میں کی ہے اور پھر دیکھو کہ امام صاحب کی یہ تقریر اور محققین یورپ کے نتائج فکر کس قدر ایک دوسرے سے ملے جاتے ہیں امام صاحب فرماتے ہیں۔

”وجود خیالی یہ ہے کہ زبان حال مثیلی رنگ میں محسوس اور شاہد بن کر سامنے آئے۔ اور یہ خاص انبیاء

اور پیغمبروں کی شان ہے اس کی مثال خواب کی ہے جس طرح خواب میں زبان حال پیغمبروں کے علاوہ عام آدمیوں کو بھی مثیلی رنگ میں نظر آتی ہے، اور وہ آوازیں سنتے ہیں۔ مثلاً کوئی خواب دیکھتا ہے کہ اونٹ اُس سے باتیں کر رہا ہے یا گھوڑا اس کو خطاب کر رہا ہے۔ یا کوئی مردہ اس کو کچھ دے رہا ہے (بقیہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)

ان علماء محققین کی رائے ہے کہ یہ شخصیت باطنہ حس کے ذریعہ مرک ہوتی ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ متناطیسی نیند سوتے ہیں ان میں پسندیدہ عقل، روشن فکر، نظر دور رس نفوس کے پوشیدہ اسرار میں اثر و نفوذ مخفی باتوں باتوں کو معلوم کر لینے کی صلاحیت و قابلیت اور اپنی حالت ظاہرہ کے اعتبار سے جاہل غبی ہونے کے باعث دنیا کے وسیع اقطار و اکناف میں سفر، یہ تمام چیزیں اس بات کی سب سے قوی دلیل ہیں کہ انسان کے لئے ایک ایسی باطنی شخصیت پائی جاتی ہے جو جسمانی حیات کے پردوں میں مستور رہتی ہے اور وہ اسی وقت ظاہر ہوتی ہے جبکہ اُس کا جسم طبعی یا صناعتی نیند میں مصروف ہو۔

پھر روپا، صحیح بھی جو صبح روشن کی طرح وقوع پذیر ہوتا ہے اور جس کے ذریعہ انسان غیبی امور کو دریافت کر لیتا ہے یا جس میں وہ بعض اوقات ایسے ایسے مشکل مسائل حل کر لیتا ہے جنہیں وہ بیداری کی حالت میں حل نہیں کر سکتا تھا، یا جس میں بعض اوقات وہ ایسے اعمال کر گزرتا ہے جنکی بحالت بیداری

دقیقہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) یا اُس کا ہاتھ پکڑا رہا ہے یا اُس سے چھینتا ہے یا یہ دیکھے کہ اُس کا ناخن شیر ہو گیا ہے یا اسی قسم کی صورتیں جن کو لوگ خواب میں دیکھا کرتے ہیں، انہیں عظیم السلام کو یہ چیزیں بیداری میں نظر آتی ہیں اور اسی بیداری کی حالت میں یہ چیزیں اُن سے خطاب کرتی ہیں۔ ایک جاگتا ہوا آدمی جس کو یہ چیزیں نظر آتی ہیں اور محسوس ہوتی ہیں وہ اس بات میں کچھ فرق نہیں کر سکتا کہ یہ خیالی گویائی ہے یا خارجی اور حسی ہے۔ خواب دیکھنے والے کو تو یہ فرق اس لئے محسوس ہو جاتا ہے کہ وہ جاگ اٹھتا ہے اور خواب بیداری دونوں کی حالتوں میں وہ فرق محسوس کرتا ہے جن لوگوں کو ولایتِ امہ حاصل ہوتی ہے اُن کو یہ تمثیلی رنگ تنہا نظر نہیں آتا بلکہ اس کا اثر عام حاضرین پر بھی پڑتا ہے، اس کی ولایت اپنے فیض کی شمعیں ان پر ڈالتی ہے اور وہ بھی وہی دیکھتے ہیں جو صاحبِ ولایت کو نظر آتا ہے۔ اور وہی سنتے ہیں جو صاحبِ ولایت کو سنائی دیتا ہے۔

(مضنون بہ علی غیر اہلہ صفحہ ۱۹ مطبوعہ مصر بحوالہ سیرۃ النبی ج ۲ ص ۳۰)



وہ کبھی ہمت بھی نہیں کر سکتا تھا اس بات کی دلیل ہے کہ انسان کے لئے اُس کی ظاہری شخصیت کے علاوہ ایک اور باطنی شخصیت ہے جو پہلی سے کہیں زیادہ بلند اور ترقی یافتہ ہے۔

ان استدلال کے علاوہ اور بھی متعدد امور ہیں جن کا اس تحقیقاتی انجمن نے نہایت دقیقہ رسی کے ساتھ عمیق مطالعہ کیا۔ پھر ساتھ ہی ان تجزیوں کا جائزہ لیا جو ان سے پہلے کئے جا چکے تھے۔ اور آخر کار انہوں نے عالمِ روح اور اُس کے لطائف و مزایا کا کھلے دل سے اقرار کر لیا۔ اس سلسلہ میں کیبرج یونیورسٹی کے مشہور ماہر علم النفس پروفیسر ڈاکٹر مائرس (Myers) نے جو اس انجمن کے بھی رکن خصوصی تھے انسانی شخصیت (Human Personality) پر ایک نہایت قابل قدر کتاب لکھی ہے جس کے متعدد ابواب میں تفصیلی نیز عبقریت، وحی، اور شخصیت باطنیہ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ہم ذیل میں چند اقتباسات کتاب مذکور کے صفحہ ۷۷ اور اُس کے بعد کے صفحات سے نقل کرتے ہیں۔

پروفیسر مائرس نے سب سے پہلے اُن ریاضی دانوں کا ذکر کیا ہے جو مشکل سے مشکل مسائل ریاضی کا درست حل فوراً بغیر کسی غور و فکر کے معلوم کر سکتے ہیں پھر لطف یہ ہے کہ اگر ان سے پوچھا جائے کہ تمہیں یہ جواب کیونکر معلوم ہوا تو وہ بجز اس کے کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں معلوم نہیں، اس سلسلہ میں پروفیسر موصوف نے بیدار نامی ایک شخص کا ذکر کیا ہے جو بڑے سے بڑے عدد کے متعلق یہ بتا سکتا تھا کہ وہ کن اعداد کی ضرب سے حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً ایک مرتبہ اُس سے پوچھا گیا کہ وہ کیا کیا اعداد ہیں جن کو ضرب دیا جائے تو ۸۶۱۷ کا عدد حاصل ہو جائے، تو اُس نے غور و قائل کے بغیر فوراً کہا کہ ۳۳ کو ۵۳ میں ضرب دیا جائے تو نتیجہ میں یہ عدد پیدا ہوتا ہے۔ پھر اُس سے پوچھا گیا کہ کس قاعدہ اور حساب سے؟ اُس نے کہا ”میں اس سے واقف نہیں، گویا اُس کا یہ جواب ایک طرح کا طبعی اقتضا تھا جس میں انسان کے ارادہ اور فہم کو دخل نہیں ہوتا۔“

مٹر سکریٹری نے مطران دانلی سے نقل کیا ہے کہ اُس نے ایک مرتبہ خود اپنی نسبت بیان کیا کہ جب میں پانچ چھ برس کی عمر کا تھا تو میں جمع و تفریق کے سوالات کسی کاغذ پر لکھے بغیر زبانی ہی بہت جلد حل کر دیا کرتا تھا۔ میری یہ حالت تین سال تک رہی مگر تعجب کی بات ہے کہ جب میں بڑا ہوا اور اسکول میں داخل ہو کر باقاعدہ ریاضی کا پڑھنا شروع کر دیا تو میرا یہ خصوصی امتیاز یا ریاضیات کے ساتھ طبعی مناسبت و فراست تدریجی طور پر کم ہونے لگی۔ یہاں تک کہ اب میں ریاضی کا ایک بہت ہی کمزور طالب علم ہوں، اس موقع پر ایک اور واقعہ کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا جو مولانا عبدالباری ندوی کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

”ترکیون متی (Trigonometry) یا مساحتہ المثلثات وغیرہ ریاضیات عالیہ کی وہ شاخیں ہیں جن کی کاجوں میں ریاضیات کے اعلیٰ مدارج میں تعلیم دی جاتی ہے، ۱۰، ۱۱، ۱۲ برس کے بچے جو علی العموم زیادہ سے زیادہ سکول کی چوتھی پانچویں جماعت میں پڑھتے ہیں۔ اُن کی ریاضی دانہ حساب کے چند ابتدائی قواعد تک محدود ہوتی ہے، جو لڑکے غیر معمولی طور پر ذہین و مخلص ہوتے ہیں اور جن کی تعلیم کا گھر پر معلم رکھ کر کچھ خاص اہتمام کیا جاتا ہے۔ وہ بہت ترقی کرتے ہیں تو ۱۳-۱۴ برس کی عمر میں اسکول کی تعلیم پوری کر لیتے ہیں۔“

لیکن گذشتہ سال اکتوبر میں (۱۷ اکتوبر) لیڈر اخبار، راج نرائن نامی ۱۱ برس کے ایک مدرس اسی لڑکے کا ”معجزہ ریاضیات“ (اسی عنوان سے) یہ چھپا تھا کہ اس نے بلا کسی معلم کی مدد کے اعلیٰ الجبر، ترکیون متی، تخیلی اقلیدس (جو میٹری) وغیرہ از خود حاصل کی ہو (سیرۃ الہی ج ۳ ص ۱۳۹) پروفیسر مائرس نے ”الہامی طور پر“ ریاضی جاننے والوں کا تذکرہ کرنے کے بعد چند شعرا اور دوسرے لوگوں کا ذکر کیا ہے اور بعض خواب کے عجیب و غریب واقعات بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں۔

”میں یقین کرتا ہوں کہ اس قسم کے واقعات دنیا میں پہلی مرتبہ ہی ظاہر نہیں ہوئے۔ بلکہ اس سے پہلے بھی لوگوں کے علم میں آچکے ہیں۔ یہ سب ہمارے شعورِ باطنی کے کرشمے ہیں جو ہر دور اور ہر زمانہ میں موجود رہتا ہے“ پھر آخر میں کہتے ہیں۔

”اب میں پورے دثوق اور جرم و اذعان کے ساتھ کتا ہوں کہ انسان میں ایک روح کا وجود یقینی ہے جو اپنے لئے قوت اور جمال کا اکتساب عالمِ روحانی سے کرتی ہے۔ اور ساتھ ہی میں اس بات کا بھی یقین رکھتا ہوں کہ تمام عالم میں ایک روح کبیر سرایت کئے ہوئے ہے جس کے ساتھ انسانی روح کو اتصال حاصل ہو سکتا ہے“

اپنی اس تحقیق کے ساتھ ہی مائرس نے فرانس کے مشہور پروفیسر ریوس سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ۔  
 ”انسان کی باطنی شخصیت ہی وہ چیز ہے جس کو عام لوگ وحی کہتے ہیں اس حالت کے لئے طبعی صفات و خصائص ہیں جو اس کے ساتھ ہی مختص ہیں، یہ باطنی شخصیت ہر چیز سے مقدم ہے اور یہ نہ کسی شخص کے سامنے جھکتی ہے اور نہ انسانی ارادہ کے تابع ہے جس وقت یہ عمل کرتی ہے تو اس طرح کرتی ہے کہ گویا وہ انسان کی کوئی صفتِ غریزہ و فطریہ ہے۔ اس باطنی شخصیت سے مدد طلب کی جاسکتی ہے لیکن اس پر کوئی جبر نہیں کیا جاسکتا“

علامہ فرید وجدی نے دائرۃ المعارف کی جلد رابع میں لفظ روح کے ماتحت ایک نہایت بیروٹ و مفصل اور جامع مقالہ لکھا ہے جس میں انھوں نے اسپرٹزم (روحانیت) کی تاریخ، محققینِ یورپ و امریکہ کی تحقیقاتی انجمنیں، ان انجمنوں کی رپورٹیں، مشہور محققین کے جتہ جتہ اقوال بیان کئے ہیں اور اسی سلسلہ میں انھوں نے سینتالیس علماء و محققین کے ناموں کی ایک منتخب فہرست دی ہے جو جو روح کے وجود اور اس کے لطائف و مزایا کا حتمی طور پر یقین رکھتے تھے۔ ان کا مختصر تذکرہ بھی

اس حصہ کی اکثر معلومات دائرۃ المعارف فرید وجدی بک کی جلد ۲۰ لفظ وحی سے ماخوذ ہیں۔

طوالت کا باعث ہوگا۔ اس لئے آخر میں ہم صرف رسل و پیغمبروں کی شہادت پر اکتفا کرتے ہیں جو اسے روح اور اس کے عجائبات کے باب میں قلم بند کی ہے، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ رسل و پیغمبروں کی طبیعت میں دارون کا ہم نپہ اور اس کا شریک خیال کیا جاتا ہے، اس نے عجائباتِ روح پر ایک کتاب لکھی ہے جس میں وہ ان الفاظ میں بر ملا اعتراف کرتا ہے۔

”میں کہتا ہوں اور ہر یہ اور مادہ پرست تھا۔ میرے ذہن میں کبھی ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہیں آسکتا تھا کہ میں کسی وقت روحانی زندگی کا اظہار کروں گا یا مادہ اور اس کی قوت کے سوا ایسے وجود کی تصدیق کروں گا جو اس دنیا میں کارفرما ہے۔ مگر میں کیا کروں! میں نے پے پے ایسے محسوس مشاہدات کئے جن کو نہیں جھٹلایا جاسکتا تھا۔ انہوں نے مجھ کو مجبور کر دیا کہ میں ان چیزوں کو حقیقی اور واقعی تسلیم کروں۔ اگرچہ ایک مدت تک میں یہ تسلیم نہیں کرتا تھا کہ یہ آثار روح سے سرزد ہوتے ہیں، لیکن ان مشاہدات نے رفتہ رفتہ میری عقل کو متاثر کرنا شروع کر دیا، نہ بطریق استدلال و حجت، بلکہ یہ مشاہدات کے پیہم تو اثر کا اثر تھا جس سے میں بجز روح کے اعتراف کے کسی اور طریقے سے بچ ہی نہیں سکتا تھا۔“

یورپ کے اساتذہ علوم جدیدہ نے روح کے متعلق جو تحقیقات کی ہیں ان سے وہ ان نتائج پر پہنچے ہیں جو کیمیل فلامریان کے نزدیک حسب ذیل ہیں۔

- (۱) روح جسم سے جداگانہ ایک وجود مستقل رکھتی ہے۔
- (۲) روح میں اس قسم کی خاصیتیں ہیں جو اب تک علوم جدیدہ کی رو سے غیر معلوم تھیں۔
- (۳) روح حواس کی وساطت کے بغیر متاثر ہو سکتی ہے یا دوسری چیز پر اپنا اثر ڈال سکتی ہے
- (۴) روح آئندہ واقعات سے واقف ہو سکتی ہے۔

پھر اس روشنی میں وحی کی نسبت ان علماء کا جو خیال ہے وہ یہ ہے کہ وحی دراصل روح

انسانی پر ایک خاص قسم کی تجلی کا نام ہے جو اُس پر اُس کی شخصیت باطنہ کے ذریعہ منور ہوئی ہوتی ہے اور اُس کو وہ باتیں سکھاتی ہے جنہیں وہ پہلے سے نہیں جانتا تھا۔ اور اُس کو ایسے امور کی طرف ہدایت دیتی ہے جن میں خود اسکی بھلائی اور اُس کی اُمت کی ترقی کا راز پنہاں ہوتا ہے۔ وحی کے باب میں علماء اسلام اور ان علماء یورپ میں اتنی بات تو مشترک ہے کہ وحی کا تعلق جسم یا کسی جہانی طاقت سے نہیں بلکہ روح سے ہی ہے۔ اور یہ انسان کے ارادہ کے تابع نہیں۔ البتہ یہ امر مختلف فیہ ہے کہ اسلام میں وحی فرشتہ کے ذریعہ نبی کے قلب پر اترتی ہے اور ان لوگوں کے نزدیک جس کو فرشتہ کہتے ہیں وہ دراصل انسان کی ہی شخصیت باطنہ ہے جو مشکل ہو کر اُس کے سامنے آجاتی ہے۔ لیکن یہ بھی کیا کم ہے کہ ان لوگوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ ایک روح اعظم ہے جو تمام کائنات میں ساری ہے اور انسانوں کی خاص خاص ارواح کو اُس کے ساتھ ایک ایسا علاقہ ہوتا ہے جس کے باعث اُس سے خارق عادات امور صادر ہوتے ہیں اور اُس پر وحی نازل ہوتی ہے۔ پھر یہ علاقہ کی کمی بیشی کا دار و مدار انسانی روح کی ذاتی استعداد پر ہے۔

اب ذرا غور کیجئے کہ ان محققین یورپ کے الفاظ میں خدا کا اور جبریل امین کا کہیں نام نہیں آیا ہے لیکن اگر ذرا تغیر و تبدل کر دیا جائے تو یہ بے تامل کہا جاسکتا ہے۔

عبارتناشتی وحسناک واجد

# تسلل وحی اور نزولِ حبریل

پہلی وحی کے بعد جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، وحی کچھ دنوں کیلئے آنی بند ہو گئی۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔ "اس میں مصلحت یہ تھی کہ پہلی وحی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو دہشت ہوئی تھی وہ جاتی رہے، آپ رفتہ رفتہ اس کو برداشت کرنے کے عادی ہو جائیں اور آپ کو اس کے دوبارہ دیکھنے کا اشتیاق بھی پیدا ہو جائے۔"

فترتِ وحی یعنی وحی رُک جانے کی مدت میں اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر نے تاریخ امام احمد حنبل سے بروایت شعبی نقل کیا ہے کہ یہ مدت تین برس تھی بعض روایات سے پتہ چلتا ہے کہ ڈہائی سال تھی لیکن ابن سعد نے حضرت ابن عباس کی روایت نقل کی ہے کہ "فترت کی مدت چند روز تھی یہی غالباً صحیح ہے۔"

آنحضرت صلعم کا حزن و ملال [وحی کے رُک جانے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا رنج و ملال ہوا

۱۵ فتح الباری ج ۱ ص ۲۲ جدید ادیشن

۱۶ بعض روایتوں میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو انقطاعِ وحی کا سخت رنج و قلق ہوا اور اوپر کفار نابکار نے طعن و طنز شروع کر دیا تو اس پر سورہ والضحیٰ کی یہ آیات نازل ہوئیں۔

وَالضُّحٰی وَاللَّیْلِ اِذَا سَجٰی مَا وَدَّعَاكَ

رَبُّكَ وَمَا قَالِی

قم ہے وقت چاشت کی اور قم ہے رات کی

جکہ وہ ساکن ہو گئی ہو۔ آپ کے رب نے نہ

آپ کو چھوڑا ہے اور نہ اُس نے دشمنی کی ہے

(تیسرا نیشہ بر حبریل آمین)

صحیح بخاری کتاب التبعیر میں حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

وَفَرَّ الْوَحْيُ فَرَّةً حَتَّىٰ حَزَنَ النَّبِيَّ  
 وُدَّ رُوحِي كَأَنَّكَ كَمَا بَلَغَتْ  
 حَزَنًا عَظِيمًا مَرَارًا كِي تَرُدُّمِي  
 مِنْ رُؤْسِ شَوَاهِقِ الْجِبَالِ  
 فَكَلَّمْنَا فِي بُدْرَةِ جِبِلِّ لَكُلِّ  
 يَلْقَىٰ مِنْهُ نَفْسٌ تَبْدِي لَهُ جَبْرِيْلُ  
 فَقَالَ يَا مُحَمَّدُ إِنَّكَ رَسُولُ اللَّهِ  
 حَقًّا فَيَسْكُنْ لِذَلِكَ جَائِشَةً وَتَقْرَأُ  
 نَفْسُهُ فَيَرْجِعُ فَاذْطَلَمْتَ عَلَيْهِ  
 فَرَّةً الْوَحْيِ عَدَمِ الْمَثَلِ ذَاكَ فَاذْطَلَمْتَ  
 اور روحی کا آنا رک گیا۔ یہاں تک کہ آنحضرت  
 صلی اللہ علیہ وسلم کو جیسا کہ ہم کو اطلاع ہوئی ہے  
 اُس کا غم ہوا۔ آپ کئی مرتبہ گھر سے روانہ ہوئے  
 کہ اپنے آپ کو پہاڑ کی چوٹیوں سے گرا دیں لیکن جب  
 کبھی آپ پہاڑ کی چوٹی پر چڑھتے تھے تاکہ اپنے  
 آپ کو گرا دیں تو جبریل ظاہر ہوتے تھے اور کہتے  
 تھے اے محمد! آپ صحیح اللہ کے رسول ہیں  
 یہ سن کر آپ کا قلب سکون پذیر ہو جاتا تھا۔  
 اور آپ لوٹ جاتے تھے۔ پھر جب وحی کی رکاوٹ  
 طویل ہو گئی تو آپ پھر ایسا کرتے کہ پہاڑ کی

دلیلیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) لیکن ہماری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ فترۃ الوحی کے بعد سب  
 پہلے سورہ مدثر کی آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ اب اگر سورہ دالّحٰجی کا نزول سورہ مدثر کی آیتوں کے بعد مانا جائے تو پھر نزول  
 وحی کے جاری ہونے کے بعد ماودٰٓءِ علف فرما کر کفار کی تردید کرنا شان نزول کے ساتھ زیادہ چسپاں نہیں ہوتا  
 اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ سورہ مدثر کے نزول تک تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بعثت کا اعلان  
 ہی نہیں کیا تھا۔ اس لئے وحی کے رک جانے پر کفار کے طعن و طنز کے کوئی معنی نہیں۔ اس بنا پر اس سورہ کے شان  
 نزول سے متعلق وہی روایت صحیح ہے جس کو امام بخاری نے تفسیر سورہ دالّحٰجی اور باب کیف نزل الوحی میں نقل کیا  
 ہے وہ یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ بیمار تھے چند روز راتوں کو اٹھ کر عبادت الہی میں مصروف نہ ہو سکے تو ایک ہمسایہ عورت  
 نے آپ کی شانِ فلک نشان میں سخت گستاخانہ کلمات کہے۔ اُن کلمات کی تردید میں یہ سورہ نازل ہوئی۔

اونی بذروہ جبل شبدی لہ جو ٹی پر چڑھتے تھے۔ اس وقت بھی جبریل ظاہر

جبریل فعال لہ مثل ذالک ہوتے اور آپ سے وہی فرماتے تھے

قرت الوحی کے بعد آپ پر جو وحی نازل ہوئی اس کا واقعہ یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

غارجہ میں تو تشریف لے جاتے رہتے ہی تھے۔ ایک دن آپ حجاز سے واپس تشریف لارہے تھے کہ

ناگاہ ایک صدائے غیب سنائی دی جو آسمان سے آرہی تھی۔ آپ نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو وہی فرشتہ

تھا جو حجاز میں آیا تھا۔ یہ فرشتہ اس وقت آسمان وزمین کے درمیان ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ حضرت

صلی اللہ علیہ وسلم فرشتہ کو اس طرح دیکھ کر خوف زدہ ہو گئے اور گھر واپس آ کر فرمایا "مجھے کمل اٹھاؤ"

اسی حالت میں یہ آیتیں نازل ہوئیں۔

يَا أَيُّهَا الْمَدِينَةُ قَانِدِي رَوْدَيْكَ اے گلیم پوش! اٹھ اور لوگوں کو ڈرا اور اپنے

فَكْبِرِي وَثِيَابِكَ فَطَهِّرِي وَالزُّجُرِي رَبِّ كِبْرِيَانِي بِيَانِكِ اور اپنے کپڑے پاک

فَاخْجِرِي رُكْهُ اور ناپاک کی کو دور کر

اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا اور اس کا آثار سوقت تک نہیں ٹوٹا جب تک کہ آپ

اس عالم ناپاکدار سے رویوش نہیں ہو گئے "فَنَحْيِي الْوَحْيَ وَتَنَابَعُ"

حضرت ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ آخری آیت قرآن جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

کی وفات سے زیادتاً دن پہلے نازل ہوئی سورہ بقرہ کی یہ آیت ہے۔

وَالْقَوْمَ اِيَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ اِلَى اللّٰهِ اور ڈرو اُس دن سے جس میں تم اللہ کی طرف

تُحْمَرُّوْنَ فِي كُلِّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَآ يُظْلَمُونَ لوٹ جاؤ گے، پھر ہر شخص کو اُس کے عمل کے مطابق

بدلہ دیا جائے گا اور اُن پر ظلم نہ ہوگا۔

لے صحیح بخاری باب بدر الوحی

لے حمارکہ مخطوطے سے تین میل کے فاصلہ پر ہے



حضرت ابن عباس سے ہی ایک دوسری روایت ہے کہ یہ نہیں بلکہ آیت ربا آخری آیت

ہے۔ واللہ اعلم (تفسیر خازن ج ۱ مطبوعہ مصر ص ۲۵۵)

چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو شروع شروع میں نزول وحی کے وقت شدت کا احساس ہوتا تھا اور پھر بر بنا بر بشریت آپ کو وحی کے بھول جانے کا بھی اندیشہ تھا۔ اس لئے آپ نزول وحی کے وقت اپنے لبوں کو جلد جلد حرکت دیتے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

لَا تُحَرِّكْ بِهِ لِسَانَكَ لِتُجَلَّ بِهٖ اِنْ  
عَلَيْنا جَمَعَةُ وَقِرَآنَا

آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیجئے کہ آپ کے

ساتھ عجلت کریں، بے شبہ قرآن کا آپ کے سینہ میں

جمع کرنا اور اس کا پڑھانا ہمارا ذمہ ہے (القیامۃ)

حضرت ابن عباس سے صحیح بخاری میں روایت ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معمول ہو گیا تھا کہ جب جبریل آتے تھے تو آپ بالکل خاموش ہو کر سنتے تھے، پھر جب جبریل چلے جاتے تو آپ اس وحی کو اسی طرح پڑھتے تھے جس طرح کہ جبریل پڑھ کر سناتے تھے۔ حضرت انس سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر آخر عمر میں وحی کی کثرت ہو گئی تھی، اس کی وجہ یہ ہے کہ آخر عمر میں مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ اطراف ملک سے وفود کی آمد کا سلسلہ جاری تھا، احکام اور لوگوں کے استفسارات بڑھ گئے تھے۔

پہلی وحی اُس وقت آئی جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بن مبارک چالیس سال تھا جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے، اس کے بعد کچھ مدت کے لئے وحی کا آنا رُک گیا پھر سلسلہ شروع ہوا تو آخر عمر تک جاری رہا۔ آپ کی وفات ۶۳ سال کی عمر میں ہوئی ہے اس بنا پر وحی کی مدت ۲۳ سال ہے۔ جیسا کہ بیان ہو چکا ہے شروع شروع میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو فرشتہ وحی کے دیکھنے

۱۵ صحیح بخاری باب کیف نزل الوحی

سے دہشت ہوتی تھی لیکن بعد میں جب آپ اُن سے مانوس ہو گئے تو پھر آپ کے شوق و اشتیاق کا یہ عالم ہو گیا کہ اگر کبھی فرشتہ وحی کے آنے میں کچھ دنوں کی تاخیر و تاویق ہو جاتی تو آپ مضطرب جاتے تھے چنانچہ صحیح بخاری کتاب التفسیر میں ہے کہ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبریل سے فرمایا کہ تم اس سے بھی زیادہ میرے پاس کیوں نہیں آتے؟ اُس کے جواب میں حضرت جبریل کی زبانی ارشاد فرمایا گیا۔

وَمَا نَنْزِلُ إِلَّا بِأَمْرِ رَبِّكَ  
 لَهُ مَا بَيْنَ أَيْدِينَا وَمَا خَلْفَنَا  
 وَمَا بَيْنَ ذَلِكَ وَمَا كَانَ رَبُّكَ  
 نَسِيًّا  
 اور ہم تو آپ کے پروردگار کے حکم اور اجازت سے اترتے ہیں اُس کو اُن تمام چیزوں کا علم ہے جو ہمارے آگے ہیں اور اُس کے درمیان میں نسیًّا (میرم) اور آپ کا رب بھولنے والا نہیں ہے۔

بارگاہ نبوی میں حضرت جبریل کی آمد کا کوئی وقت متعین نہیں تھا، صبح، شام، دن اور رات جب خدا کا حکم ہوتا وہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر خدا کا پیغام پہنچاتے تھے، ماہم جس طرح بارش ہونے والی ہوتی ہے تو اُس کے آثار و علامات پہلے سے فضا میں محسوس ہونے لگتے ہیں۔ وحی کے نزول یا آمد جبریل کا وقت قریب ہوتا تھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے ہی یہ بات محسوس ہو جاتی تھی اور آپ بے چینی سے اس کا انتظار شروع کر دیتے تھے۔ آپ کی یہ حالت ایسی واضح اور ظاہر ہوتی تھی کہ اگر اُس وقت کوئی شخص آپ کے پاس ہوتا تو وہ بھی اُس کو محسوس کر لیتا تھا۔

حضرت ابو ذر غفاری کا بیان ہے کہ میں ایک شب میں باہر نکلا تو دیکھا کہ سید ولد آدم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنہا چل رہے ہیں اور آپ کے ساتھ کوئی شخص بھی نہیں ہے میں نے خیال کیا کہ غالباً اس وقت آپ کسی کی معیت پسند نہیں کرتے اس لئے میں چاندنی میں چلنے لگا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو میں نظر آیا۔ آپ نے پوچھا "کون"؟ میں نے عرض کی "ابو ذر" میں

آپ پر قربان ہوں۔ ارشاد ہوا۔ اے ابو ذر! آؤ تو۔ میں اس ارشاد گرامی کے مطابق تھوڑی سی دور چلا تھا کہ زبان نبوت یوں گوہر بار ہوئی۔ چوہا باب ثروت ہیں وہی قیامت میں کنگال ہونگے۔ مگر ہاں وہ لوگ متشکی ہیں جن کو اللہ نے مال دیا اور انہوں نے اُس کو دائیں بائیں، آگے اور پیچھے بکھیر دیا اور اُس میں نیکی کے کام کئے۔ ابو ذر کا بیان ہے کہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کچھ دیر تک ہی چلا تھا کہ آنحضرت نے فرمایا۔ تم یہاں بیٹھ جاؤ، یہ فرما کر آپ نے مجھ کو ایسے میدان میں بٹھا دیا جس کے ارد گرد پتھر پڑے ہوئے تھے۔ پھر فرمایا۔ دیکھنا تم یہاں بیٹھے رہنا یہاں تک کہ میں واپس آؤں۔ اس کے بعد آپ حجرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ یہاں تک کہ میری نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔ آپ دیر تک وہاں ٹھہرے رہے، پھر جب آپ آ رہے تھے تو میں نے سنا کہ آپ فرما رہے تھے۔ اگرچہ وہ چوری کرے یا زنا کرے۔ جب آپ آگئے تو مجھ سے صبر نہیں ہو سکا اور میں پوچھ ہی بیٹھا۔ اے اللہ کے نبی! میں آپ پر قربان ہو جاؤں، آپ حجرہ کی سمت میں کس سو باتیں کر رہے تھے، میں نے تو کسی کی آواز نہیں سنی کہ وہ آپ کی بات کا کوئی جواب دیتا۔ ارشاد ہوا۔ یہ جبریل تھے جو حجرہ کے پہلو میں میرے سامنے آئے اور انہوں نے کہا کہ آپ اپنی امت کو خوشخبری سنا دیجئے کہ جس شخص کا انتقال اس حالت میں ہو گیا کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بناتا تھا، وہ جنت میں داخل ہو گا۔ میں نے پوچھا۔ اگرچہ وہ سرقہ یا زنا کرے۔ جبریل نے جواب دیا۔ ہاں! اگرچہ وہ سرقہ یا زنا کا مرتکب ہو، میں نے پھر دوبارہ یہی سوال کیا تو جبریل نے پھر یہی جواب دیا۔ حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ آپ نصف شب کو سو رہے تھے کہ اٹھ کر بقیع کے

لے مدینہ منورہ کی شمالی جانب میں ایک مقام کا نام ہے جہاں یزید بن معاویہ کے زمانہ میں مشہور واقعہ قتل و قتال ہوا تھا۔ اور جس میں اہل مدینہ پر لڑہنگن مظالم کئے گئے تھے۔

کے صحیح بخاری کتاب الرقاق

قبرستان میں تشریف لے گئے۔ صبح کو آپ نے فرمایا: "رات جبریل نے مجھ کو پیغام دیا کہ میں اس وقت بقیع میں جا کر دعا و مغفرت کروں۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کی ہر ہر ادا اور آپ کا ہر ہر فعل خدا کے حکم اور اس کے ارشاد کے مطابق ہوتا تھا۔ اس بنا پر اگر کبھی آپ سے کوئی ایسا فعل سرزد ہوتا جو شاخداوندی کے مطابق نہیں ہوتا تھا تو فوراً جبریل امین آکر اس کی اصلاح کر دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ خندق سے مسلمانوں کی فوج لیکر واپس آئے اور ہتھیار کھول کر غسل فرمایا تو جبریل نے آکر کہا: "آپ نے ہتھیار کھول دیئے حالانکہ ہم اب تک ہتھیار بند ہیں اور بنو قریظہ کو ابھی ان کی غداری کا بدلہ دینا ہے۔"

حضرت جبریل اگرچہ عموماً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس نہائی میں آتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی اس وقت بھی آتے تھے جب آپ کے پاس مجمع ہوتا تھا یا ایک دو اصحاب بیٹھے ہوتے تھے اس مضمون کی کئی ایک روایات پہلے گزر چکی ہیں، ایک مرتبہ آپ ام المؤمنین حضرت عائشہ کے ساتھ تشریف فرما تھے کہ آپ نے فرمایا: "اے عائشہ! جبریل تم پر سلام بھیجتے ہیں۔" ام المؤمنین نے فرمایا: "یا رسول اللہ! آپ وہ دیکھتے ہیں جو میں نہیں دیکھتی۔" ایک دفعہ آپ نے غزوہ بدر میں فرمایا: "دیکھو! یہ جبریل اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑے ہیں۔"

رمضان میں جبریل کی آمد زیادہ ہوتی تھی۔ اس ماہ مبارک میں وہ ہر روز آکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن مجید سنتے تھے اور آپ کو سناتے تھے۔

وحی خیر متلو | یہ بات یقینی ہے کہ حضرت جبریل بعض اوقات خدا کی طرف سے ایسے پیغامات بھی لیکر آتے تھے جو قرآن مجید میں موجود نہیں ہیں، اسی بنا پر علماء اسلام نے وحی کی دو قسمیں کر دی ہیں۔

۱۔ نہائی باب الاستنفا للمؤمنین ۲۔ بخاری باب غزوہ خندق ۳۔ بخاری غزوہ بدر

ایک متلو اور دوسری غیر متلو، وحی متلو تو وہی ہے جو قرآن مجید کی صورت میں مسلمانوں کے سینوں میں اور سفینوں میں محفوظ ہے۔ دوسری قسم وحی غیر متلو وہ ہے جو احادیث صحیحہ کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے خود قرآن مجید کی تصریح

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ (النجم)

آپ کا نطق وہ وحی ہوتا ہے جو آپ پر بھیجی جاتی ہے

کے مطابق وہ بھی وحی ہی ہے اور ہمارے لئے سرخسہ سعادت و فلاح ہے۔ چونکہ احکام و مسائل کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ فرماتے تھے وحی سے فرماتے تھے۔ اس بنا پر اگر کوئی شخص آپ سے کوئی حکم دریافت کرتا اور وہ آپ کو معلوم نہ ہوتا تو آپ جو اب میں خاموش رہتے اور وحی کا انتظار فرماتے تھے، یعلیٰ بن امیہ کا بیان ہے کہ حجۃ الوداع کے سلسلہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جمرانہ میں قیام پذیر تھے کہ ایک شخص نے آکر سوال کیا یا رسول اللہ! آپ اس شخص کے بارے میں کیا حکم دیتے ہیں جس نے کپڑے میں خوشبو مل لینے کے بعد احرام کی نیت کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی قدر انتظار کیا، یہاں تک کہ آپ پر نزولِ وحی کی کیفیت طاری ہوئی، جب وہ کیفیت زائل ہو گئی تو آپ نے اس سائل کو بلوایا وہ آگیا تو آپ نے فرمایا: "جو خوشبو تم مل چکے ہو اس کو تین دفعہ دھو ڈالو اور اس کپڑے کو آٹا رو، پھر عمرہ ادا کرو۔"

ایک مرتبہ ایک یہودی عالم نے آپ سے پوچھا: "بہترین جگہ کون سی ہوتی ہے؟" آپ خاموش رہے اور پھر فرمایا: "میں جبریل کے آنے تک خاموش رہوں گا" چنانچہ جب جبریل آئے تو آپ نے ان سے پوچھا: "بہترین جگہ کونسی ہوتی ہے؟" جبریل نے کہا: "اس مسئلہ میں تو سائل اور مسئول منہ یعنی آپ اور میں دونوں برابر ہیں، لیکن ہاں میں اپنے رب سے سوال کرونگا۔ پھر جبریل (دو بار آئے)

لہٰذا روایت اس کتاب میں پہلے بھی ایک جگہ گزر چکی ہے۔

اور انہوں نے کہا: اے محمد! میں اللہ سے اتنا قریب ہو گیا تھا کہ ایسا قریب کبھی نہیں ہوا تھا! آنحضرت نے پوچھا: یہ کیونکر ہوا؟ وہ بولے: "میرے اور خدا کے درمیان نور کے ایک ہزار پر دو حائل تھے، اللہ نے فرمایا: "بدترین جگہ بازار میں اور بہترین جگہ مسجدیں ہیں۔"

(صحیح ابن جان ج ۱ ص ۱، مطبوعہ مجتہبائی پریس دہلی)

وحی متلو اور غیر متلو دونوں میں حکم کے اعتبار سے فرق یہ ہے کہ وحی متلو یعنی قرآن مجید کا ایک ایک حرف متواتراً منقول ہے اور اس لئے وہ بالکل قطعی اور حتمی طور پر خدا کا کلام ہے۔ لیکن اس کے برعکس وحی غیر متلو یعنی احادیث احکام و مسائل کا یہ حال نہیں ہے۔ ان کا بہت کم حصہ متواتراً منقول ہے پھر جو متواتراً منقول ہیں، چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بھی الفاظ کو خدا کے الفاظ نہیں بتایا، اس لئے وہ معنی تو ارشاد خداوندی ہیں لیکن لفظاً نہیں۔

## قرآن مجید وحی الہی کیوں ہے؟

گذشتہ مباحث کے بعد آخر میں ایک سوال یہ باقی رہ جاتا ہے کہ قرآن مجید وحی الہی کیوں ہے؟ اس کے کیا دلائل ہیں؟ اور وہ کون سے خصائص و اوصاف ہیں جن کی بنا پر قرآن کلام بہتر نہیں بلکہ کلام الہی ہے؟ اس سوال کا ایک واضح اور کھلا جواب تو یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات جو پیغمبری کے تمام خصائص و محامد کی جامع ہے۔ قرآن کے وحی الہی ہونے کی سب سے بڑی اور روشن دلیل ہے۔ گذشتہ ابواب میں ضمنی طور پر اس کی طرف متعدد جگہ اشارات ملیں گے۔ ہم یہاں قرآن کی صرف حیثیت کلام کو پیش نظر رکھ کر گفتگو کرتے ہیں۔

وصف اعجاز قرآن کے بیشمار خصائص کے لئے ایک جامع لفظ اعجاز ہے یعنی قرآن مجید اپنے اعجاز کے سبب کلام الہی ہے جس طرح کسی جاندار چیز کا پیدا کرنا۔ اور پھر مارٹو الٹا۔ آسمان سے پانی کا برسنا اور پھر بادلوں کا کھل جانا۔ مشرق سے آفتاب کا طلوع ہونا اور پھر غروب ہو جانا۔ ہوا کا چلنا اور تھمنا۔ یہ سب چیزیں انسان کے دسترس اور قابو سے باہر ہیں اور اس لئے یہ سب ایک زبردست قوت کے وجود کی دلیل ہیں جو اپنی قدرت و حکمت سے اس کا رگاہ بہت و بود کو انتہائی نظم و انتظام کے ساتھ چلا رہی ہے اسی طرح قرآن کا معجز نہ ہونا یعنی انسانوں کا اس جیسا کلام لانے سے عاجز رہنا اس کے وحی الہی ہونے کی بین دلیل ہے۔

وجہ اعجاز | لیکن سوال یہ ہے کہ قرآن کا یہ اعجاز کس وصف کے لحاظ سے ہے؟ علماء اسلام نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس سوال کے متعدد جوابات دیئے ہیں جن کو مختصراً اس طرح

بیان کیا جاسکتا ہے۔

(۱) قرآن مجید کا نظم کلام اور اسلوب ادا معجز ہے تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ عرب کے کلام نثر کے لئے جتنے اسالیب مقرر تھے۔ قرآن مجید نے ان سب سے الگ ایک نیا اسلوب اختیار کیا ہے جس کا مثل لانا انسان کے حیثہ قدرت سے باہر ہے یہ مسلک معتزلہ کی ایک بڑی جاعت کا ہے۔

(۲) شاعرہ قرآن مجید کا اعجاز فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے ماننے ہیں یعنی وہ کہتے ہیں کہ دنیا کا بڑے سے بڑا فصیح و بلیغ متکلم بھی قرآن جیسا فصیح و بلیغ کلام نہیں بول سکتا۔

(۳) بعض متکلمین کے نزدیک قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ ایک نبی امی کی زبان سے ادا ہوا۔

(۴) بعضوں کی رائے یہ ہے کہ قرآن مجید میں گذشتہ اقوام و مل کے جو واقعات بیان کئے گئے ہیں اور بعض آئندہ واقعات کے بارہ میں جو پیش گوئیاں کی گئی ہیں اور وہ سب حرف بجز پوری ہوئی ہیں قرآن ان کے لحاظ سے معجز ہے۔

(۵) بعض علماء کہتے ہیں کہ قرآن کا اعجاز یہ ہے کہ وہ شروع سے آخر تک ایک ہی اسلوب

اور ایک ہی اسٹائل میں ہے۔ اس میں رفع و خفض اور نشیب و فراز بالکل نہیں پایا جاتا۔

(۶) ایک جماعت کہتی ہے کہ اعجاز قرآن کا اصل راز اس کے احکام و تعلیمات میں ہے کہ

کوئی انسانی دماغ اس طرح کے معتدل اور پراز حکمت و ہدایت احکام وضع نہیں کر سکتا۔

(۷) کچھ حضرات کی رائے ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز اس کی حیرت انگیز تاثیر ہے جس سے عربی

کا ذوق نہ رکھنے والے بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے۔

(۸) کسی کسی نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید کا اعجاز یہ ہے کہ وہ دلوں کے چھپے ہوئے بھید ظاہر

کر دیتا تھا جن تک کسی انسان کی رسائی ہو ہی نہیں سکتی۔

(رسلہ حاشیہ ملاحظہ ہو صفحہ آئندہ پر)



لیکن اصل یہ ہے کہ یہ تمام ترجیحات اپنی اپنی جگہ پر قرآن مجید کے حُسن تمام و کمال کے کسی ایک رُخ کو نمایاں کرتی ہیں ان میں باہمی کوئی تعارض و تضاد نہیں۔ فرض کرو حُسن و جمال کا کوئی پیکر اتم اگر چند مختلف الذوق لوگوں کے سامنے آجائے تو اُس میں سے ہر شخص کس طرح اپنے اپنے مذاق کے مطابق اُس کی تشریح و توضیح کرے گا۔ کوئی تناسب اعضاء و جوارح پر فریفتہ ہوگا۔ اور کسی کو رنگ و نرہت پر شیفنگی ہوگی کوئی قد و قامت کی موزونیت پر دل و جان فدا کرے گا اور کسی کو لب لعلین و کامل مشکیں کا سودا ہوگا۔ کسی کے لئے چشم زگی جادوئے بابل کا کام کرے گی۔ اور کوئی جہاں آتیش کی فوں کاریوں کا ہلاک ستم ہوگا۔ غرض یہ ہے کہ حُسن جب کامل اور جمال جب اتم ہوتا ہے تو اُس کی ہر ہر اہل نظر کو دعوت نظر و دید دیتی ہے اور پھر حُسن نظارہ سوز کی جلوہ پاشیوں میں نگہ اشتیاق کی نگ پائی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اسے قدم قدم پر "جا ایں جا ست" کا سا نظر آتا ہے اور وہ وہیں مخو حیرت ہو کر رہ جاتی ہے۔

ز فرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست  
لیکن جو اہل نظر ہوتے ہیں وہ جان لیتے ہیں کہ اگرچہ تفسیریں مختلف ہیں اور انداز ہائے بیان بھی بدلے ہوئے ہیں لیکن یہ سب رہنمائی کرتی ہیں ایک ہی کی طرف اور یہ سب بیانات ایک حقیقت کلی کی ہی جزئی تشریحات ہیں۔

عباد اتنا شتی و حسنک واحد وکل الی ذاک الجمال بشیر

قرآن مجید نے خود اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا ہے۔ اور منکرین کو چیلنج دیا ہے کہ اگر وہ اُسے کلام الہی نہیں مانتے تو انھیں چاہئے کہ اُس کی کسی چھوٹی سے چھوٹی سورۃ کا مثل لاکر دکھائیں۔

رہ حافیہ صفیہ گذشتہ حضرت شاہ ولی اللہ نے الفوز الکبیر باب ۱۴ میں علامہ ابن حزم نے لفضل فی الملل واخل میں اور علامہ سیوطی نے آفتان میں اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان وجوہ اعجاز پر تفصیل سے کلام کیا ہے۔

اس بنا پر ہم کو ان اختلافات سے قطع نظر کر کے خود قرآن میں تلاش کرنا چاہئے کہ وہ اپنے وجود و اعجاز میں کیا دلائل پیش کرتا ہے۔ گذشتہ باب "وحی اور قرآن" میں بھی ان دلائل کا اجمالی ذکر آچکا ہے ہم یہاں ان کو کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہیں۔

تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں پانچ چیزوں کا ذکر کیا ہے۔ (۱) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت (۲) گذشتہ اقوام کے واقعات اور آئندہ واقعات کے متعلق پیشگوئیاں (۳) فصاحت و بلاغت (۴) قرآنی احکام و مسائل (۵) قرآن کی غیر معمولی تاثیر ذیل میں انھیں پانچ امور کی تفصیل درج ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت | قرآن مجید میں ارشاد ہے۔

وَمَا كُنْتَ تَتْلُو مِنْ قَبْلِهِمْ مِنْ  
كِتَابٍ وَلَا تَخْتَطُّ بِمِثْلِكَ إِذًا  
لَا رِتَابٍ الْمُبْطِلُونَ هَلْ هُوَ آيَاتٌ  
بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ  
وَمَا يَجْعَلُ بَيْنَنَا وَاللَّاطِمُونَ  
پھر اسی سورہ میں آگے چل کر ہے

أَوَلَمْ يَكْفِيهِمْ أَنَّا أَنْزَلْنَا عَلَيْكَ  
الْكِتَابَ يُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ هَٰ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ  
لَرْحَةً وَذِكْرًا لِقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ه  
کیا ان لوگوں کے لئے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ  
ہم نے آپ پر کتاب نازل کی جو ان پر تلاوت  
کی جاتی ہے، اس میں ایمان والوں کے لئے  
رحمت اور نصیحت ہے۔ (عنکبوت)

دیکھو ان آیات میں اللہ تعالیٰ کس طرح قرآن مجید کے وحی الہی ہونے اور اس کے منجانب اللہ

نازل ہونے کی نشانی (آیت) یہ بتاتا ہے کہ وہ ایک ایسے نبی امی پر نازل ہوا ہے جو نہ کوئی کتاب پڑھ سکتا تھا اور نہ کچھ لکھنا جانتا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی آیت ایک ایسی حقیقت ثابتہ ہے کہ آپ کی دعوت توحید و اسلام پر برہم ہو کر کفار مکہ نے کیا کچھ نہیں کہا۔ وہ کہنا افراتفرات اور بہتان تھا جو ان لوگوں نے پیغمبر حق کے برخلاف نہیں بانڈھا۔ آپ کو (معاذ اللہ) ساحر کہا۔ کاہن کہا۔ سب کچھ کہتے رہے اور ان پزارسانی میں بھی انھوں نے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ لیکن یہ کہنے کی جرأت کسی کو نہ ہو سکی کہ آپ اُمّی کہاں ہیں؟ آپ تو نزولِ قرآن سے پہلے بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ عکاظ اور ذوالحجہ کے سالانہ اجتماعات میں ادھر ادھر کے آتش بیان خطیب اور نامور شعراء جمع ہو کر جو ہر سخن کی نمائش کرتے اور اس آن بان سے فصاحت و بلاغت اور زور بیان و کلام کی داد دیتے تھے کہ تمام مجمع میں دھوم مچ جاتی تھی۔ لیکن آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے جو عمر مبارک کے چالیس سال ہوئی کسی ایک شخص نے بھی نہیں دیکھا اور نہ سنا کہ آپ نے بھی کسی مجمع میں شریک ہو کر کوئی پر زور خطبہ دیا ہو۔ حالانکہ اگر قرآنی فصاحت و بلاغت کا ملکہ آپ کا ایک ذاتی وصف تھا تو اس کا ظور روز بروز نہیں چالیس سال کی عمر سے پہلے کبھی ایک مرتبہ تو ہوا ہوتا۔ یہ ظاہر ہے کہ ہر انسان کے ذاتی جوہر و کمال کے ابھرنے اور نمایاں ہونے کا زمانہ اسکا عہد شباب ہوتا ہے۔ چالیس برس کی عمر سے تو قومی میں انحطاط کے ساتھ انسان کے ذاتی ملکات و اوصاف میں بھی انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔

ہاں اس میں شبہ نہیں کہ سید کوئین عرب میں سب سے زیادہ فصیح تھے۔ چنانچہ آپ نے خود فرمایا ہے ”میں تم سب میں فصیح تر ہوں کیونکہ میں قریش کے خاندان سے ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے (طبقات ابن سعد ج ۱) لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے باوصف آپ نے نبوت ملنے سے پہلے کبھی کہیں ایک مرتبہ بھی کوئی ایسا خطبہ دیا جو قرآن مجید

کے انداز بیان اور اسلوب کلام سے متاثر ہوتا ہے جس میں قرآن کے بیان کے مطابق حکمت و عظمت اور اسرارِ عالم اور کائنات کے گنچنے بھرے ہوئے ہوں؟ پھر اگر ایسا ہوتا تو آپکی وہ حیرت و گمشدگی کی حالت کس طرح ہو سکتی تھی جو نزولِ وحی کے بالکل آغاز میں ہوئی اور جس کی طرف قرآن مجید نے

وَوَجَدَكَ ضَالًّا فَهَدَىٰ  
اور خدائے آپکو حیرت زدہ پایا اور اُسکو ہدایت دی

کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

پس سوچو اور غور کرو کہ کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں ہے کہ عرب کا ایک گوشہ نشین اُمّی جو نہ لکھنا جانتا ہے اور نہ پڑھنا۔ اور جو نہ علماء کے ساتھ اٹھا بیٹھا ہے اور نہ دایک دو معمولی شعروں کے علاوہ کہیں مکہ سے باہر آتا جاتا ہے جو فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کی عام گرم بازاری کے اور خود اُس فضا میں رہنے کے باوجود نہ ایک شعرموزوں کر سکتا ہے اور نہ کوئی خطبہ دیتا ہے۔ لوگ اُسے "صادق" "امین" اور "استباز" کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہیں۔ لیکن حکمتِ آکبِ فصیح و بلیغ کی حیثیت سے اُسے کوئی شہرت حاصل نہیں ہے۔ وہ عمر کا بہترین حصہ (چالیس سال سے پہلے تک) اسی گنہامی میں بسر کر دیتا ہے۔ پھر جب قویٰ میں انحطاط کا زمانہ شروع ہوتا ہے تو یہ ہی امی ایک بالکل عجیب و غریب طریقہ پر دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے جو لکھنا پڑھنا بھی نہیں جانتا تھا۔ اُس نے عالم کون و فساد کے حقائق سے سے نقابِ اُلط و می حکمت و ہدایت کے دفتر کھول دیے، بڑے بڑے فلاسفہ جن اسرار و رموزِ کائنات کی گرہ کشائی نہیں کر سکتے تھے اُس نے چشمِ زدن میں اُن سب کو حل کر کے رکھ دیا پھر اسی خاموش اُمّی کی زبانِ حق تر جان سے جو پیغام "قرآن" کے نام سے نکلا اُس نے فصاحت و بلاغت کے ایسے ایسے گوہر ہائے گراناہیہ کا انبار لگا دیا کہ بڑے بڑے فصحا و بلغاء کی زبانیں بار بار کے چیلنج کے باوجود اُس کے کسی ایک حصہ کا جواب لانے سے بھی گنگ ہو گئیں اور اس

امی کی زبان کا ایک ایک لفظ شدید ترین ظلمتوں میں بھی حقانیت و صداقت کا آفتاب جہان تاب بن کر چمکا اور اس طرح چمکا کہ

عالم تمام مطلع الوار ہو گیا

شیخ نسوی کی نعت کے یہ دو شعر پڑھو اور دیکھو کہ اس کا ایک ایک لفظ کس طرح اصل حقیقت کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کرتا ہے۔

کلمے کہ چرخ فلک طور است ہمہ نور ہا پر تو نور اوست  
میتھے کہ ناکردہ قرآن دست کتب خانہ چند ملت بست

تو پھر بتاؤ کہ کیا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمتیت قرآن کے اعجاز کی دلیل نہیں ہے اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قرآن آنحضرت کا نہیں بلکہ خدا کا کلام ہے؟

واقعات غیب | قرآن مجید کے بیان کے مطابق قرآن کے وحی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اس میں کھلی قوموں کے اُن صحیح صحیح واقعات کا بیان ہے جن کے علم کا کوئی ذریعہ آپ کے پاس موجود نہیں تھا۔ اس طرح کے واقعات کا علم آپ کو تین طریقوں سے ہی ہو سکتا تھا ایک یہ کہ یہ سب واقعات آپ کے سامنے پیش آتے۔ دوسرے یہ کہ آپ نے اُن کو کسی کتاب میں پڑھا ہوتا دیکھا۔ تیسرے یہ کہ آپ کی صحبت ایسے لوگوں کے ساتھ رہی ہوتی جنہیں ان واقعات کا علم تھا اور آپ اُن سے ان کا تذکرہ سنتے۔ قرآن مجید ان تینوں ذرائع میں سے ہر ایک کی نفی کرتا ہے۔ پہلے ذریعہ علم کی نسبت حضرت موسیٰ کے قصہ میں ارشاد ہے۔

وَمَا كُنْتَ بِجَانِبِ الْفَرَجِ إِذْ قَضَيْنَا  
إِلَىٰ مُوسَىٰ الْأَمْرَ وَمَا كُنْتَ مِنَ  
الشَّاهِدِينَ وَلَكِنَّا أَنشَأْنَا قُرُونًا  
آپ مغربی جانب میں نہ تھے جب ہم نے موسیٰ کو  
اپنا حکم بتایا اور نہ آپ وہاں دیکھ رہے تھے  
لیکن ہم نے کئی جماعتیں پیدا کیں اور اُن پر

فَتَطَاوَلَ عَلَيْهِمُ الْعَمْرُ وَمَا كُنْتَ  
 نَارِيًا فِي أَهْلِ مَدْيَنَ تَتَلَوُا عَلَيْهِمُ  
 أَيْتِنَا وَلَكِنَّا كُنَّا مِنْ سَبِيلِينَ وَمَا كُنْتَ  
 بِمَجَانِبِ الطُّورِ إِذْ نَادَيْنَا لَكِنَّ رَحْمَةً  
 مِنْ رَبِّكَ لِنُنذِرَ قَوْمًا مِمَّا أَنْتَهُمْ  
 مِنْ نَذِيرٍ مَنْ قَبْلِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ  
 مدت دراز گذر چکی اور نہ آپ مدین والوں میں  
 تھے کہ ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سناتے ہوتے  
 لیکن ہم رسول بھیجے رہتے ہیں اور نہ آپ طور  
 کے کنارے تھے جب ہم نے انکو ندادی لیکن  
 یہ آپ کے رب کا انعام ہوا کہ آپ ان لوگوں کو  
 ڈرا میں جن کے پاس آپ پہلے کوئی ڈرا نہ ملا  
 نہیں آیا ہوتا کہ یہ برعظمت گیر ہوں  
 (قصص)

حضرت مریم اور حضرت زکریا کے واقعہ میں ہے۔

ذَلِكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهِمْ  
 إِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلقُونَ  
 أَقْلَامَهُمْ يَكْفُلُ لَهُمْ وَمَا  
 كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ  
 یہ گزشتہ زمانہ کی خبروں میں ہے جبکہ ہم بذریعہ وحی  
 آپ پر نازل کرتے ہیں اور آپ ان کے  
 پاس موجود نہ تھے جب وہ اپنا پانسہ ڈال رہے  
 تھے اور نہ آپ اس وقت موجود تھے جبکہ  
 وہ جھگڑ رہے تھے۔  
 (آل عمران)

حضرت یوسف کے واقعہ میں بھی اسی طرح ارشاد ہے۔

دوسرا ذریعہ علم یہ تھا کہ آپ ان واقعات کو کسی کتاب میں پڑھتے۔ قرآن اس کی بھی نفی  
 کرتا ہے۔ چنانچہ اس سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کے بیان میں جو آیت گذر چکی  
 ہے اس میں اس مضمون کی صاف تصریح ہے اس کے علاوہ ایک اور آیت بھی ہے۔  
 مَا كُنْتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا  
 الْإِيمَانُ (شوری) ایمان کسے کہتے ہیں۔

تیسرا ذریعہ علم یہ ہو سکتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان واقعات کو کسی سے سنتے۔  
قرآن مجید اس کی بھی نفی کرتا ہے۔ ارشاد ہے۔

تِلْكَ مِنْ أَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيهَا  
إِلَيْكَ مَا كُنْتَ تَعْلَمُهَا أَنْتَ وَلَا  
قَوْمُكَ مِنْ قَبْلِ هَذَا (ہود) تھے اور نہ آپ کی قوم جانتی تھی۔

ہر شخص جانتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے چالیس سال کی زندگی مکہ معظمہ  
میں گزاری۔ اس تمام مدت میں آپ کا صرف دو مرتبہ شام کے سفر میں جانا ثابت ہے۔ ایک مرتبہ  
آپ اپنے چچا ابوطالب کے ساتھ گئے تھے۔ اس وقت آپ کا عہد طفولیت تھا۔ اور دوسری مرتبہ  
آپ عہد شباب میں تشریف لے گئے تھے لیکن یہ سفر چند روز کے لئے تھا۔ قیام مکہ کے زمانہ میں  
آپ قریش والوں میں ہی رہتے سہتے تھے اور یہ لوگ جیسا کہ قرآن میں تصریح ہے اہل کتاب  
نہ ہونے کے باعث گذشتہ اقوام و ملل کی تاریخ سے بالکل نا آشنا تھے۔ اس بنا پر ظاہر ہے کہ آنحضرت  
صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ تیسرا ذریعہ علم بھی سربسرفوتو تھا۔

ان تینوں ذرائع علم کی نفی کے بعد قرآن کا یہ فرمان کہ نُوحِيهَا إِلَيْكَ خود بخود واضح ہو جاتا ہے  
اور ایک ایسی حقیقت مسلمہ بن کر سامنے آتا ہے کہ کسی کو اس سے انکار نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے  
کہ کفار و مشرکین جس طرح آپ کی اُمتیت کی تلمذیہ نہیں کر سکے۔ اُن میں سے کسی ایک شخص کو بھی یہ  
کہنے کی جرأت نہ ہوئی کہ ”آپ یہ کیسے فرماتے ہیں کہ یہ واقعات غیب مجھ کو وحی سے معلوم ہوئے ہیں  
آپ تو یہ واقعات ظالم شخص سے سنتے تھے، یا اُس کے پاس آپ کی نشست و برخاست تھی۔“ اس  
قسم کے دعویٰ کا اظہار اگر ہوتا تو علماء ہود و نصاریٰ کی طرف سے ہو سکتا تھا، اور حضور کی مدنی زندگی  
میں انہوں نے بار بار اس کا امتحان بھی لیا لیکن آخر کار اُن کو بھی قرآن کے وحی الہی ہونے کا اقرار

کرنا پڑا۔ اور کسی ایک شخص کو بھی آنحضرت کی امیت کا انکار کرنے کا حوصلہ نہیں ہو سکا۔  
 واقعات آئندہ کی پیشین گوئی | اخبار من الغیب کے سلسلہ میں قرآن مجید کی وہ پیش گوئیاں بھی داخل  
 ہیں جو بعض نہایت ہی مستبعد امور سے متعلق ہیں اور جو حرف بحرف صحیح ثابت ہو کر رہیں۔  
 غلبہ روم کی پیشین گوئی | ان پیشین گوئیوں میں سب سے زیادہ حیرت انگیز اور نمایاں تر پیشین گوئی غلبہ  
 روم کی ہے قرآن میں اس کا ذکر اس طرح ہے۔

الْقَرَّةَ غَلَبَتِ الرُّومَ فِي آدْنَى  
 الم۔ قریب کے ملک میں رومی مغلوب ہو گئے ہیں  
 الْأَرْضِ وَهُمْ مِنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ  
 اور وہ اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں  
 سَيَغْلِبُونَ فِي بَعْضِ سِنِينَ لِلَّهِ الْأَمْرُ  
 غالب آجائینگے اللہ کے ہی ہاتھ ہے سکام  
 مِنْ قَبْلِ وَمِنْ بَعْدِ وَيَوْمَئِذٍ يَفِرُّ  
 پہلے اور پچھلے، اور اس دن مسلمان خوش ہونگے  
 الْمُؤْمِنُونَ بِنَصْرِ اللَّهِ يَنْصُرُ مَنْ  
 اللہ کی مدد سے، اللہ جس کی چاہتا ہی مدد کرتا ہی  
 يَشَاءُ وَهُوَ الْعَزِيزُ الرَّحِيمُ وَعَدَا  
 اور وہی زبردست اور رحم کرنے والا ہی۔ اللہ  
 اللَّهُ لَا يُخْلِفُ اللَّهُ وَعْدَهُ وَلَكِنْ  
 کا وعدہ ہو چکا۔ اللہ اپنے وعدہ کے خلاف  
 أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (الروم) نہ کرے گا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے تھے۔

جنگ روم و ایران کا واقعہ | اس واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ عرب کے دائیں بائیں روم اور ایران کی دو  
 طاقتور حکومتیں قائم تھیں۔ رومی حکومت عیسائی تھی اور ایرانی سلطنت مجوسی۔ دونوں میں ایک عرصہ  
 سے کشمکش چلی آرہی تھی۔ ایرانی سلطنت کے تخت پر نوشیرواں کا پوتا اور ہرمز کا بیٹا خسرو  
 (Chosroes) قابض تھا اور رومی حکومت کی عنان اختیار و اقتدار ہرقل (Heraclius)  
 کے ہاتھ میں تھی۔ ان دونوں حکومتوں میں جنگ و پیکار کا سلسلہ ۶۰۲ء سے ۶۱۶ء تک جاری رہا  
 آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت عیسوی تاریخ کے حساب سے ۶۱۰ء میں ہوئی۔



اور اللہ میں آپ کے فرق مبارک پر نبوت و رسالت کا تاج زرفشاں رکھا گیا۔ دونوں سرحدوں کے قرب کی وجہ سے مکہ والوں کو طبعی طور پر اس جنگ سے گہری دلچسپی تھی۔ یہاں برابر اسکی خبریں پہنچتی رہتی تھیں۔ ایرانی مجوس یعنی آتش پرست تھے۔ اس لئے مکہ کے کفار و مشرکین کو ان کے ساتھ دلی ہمدردی تھی اور وہ دعائیں کرتے تھے کہ جنگ میں ایرانیوں کو فتح و کامرانی حاصل ہو۔ لیکن مسلمان طبعی طور پر رومیوں کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ کیونکہ یہ لوگ عیسائی ہونے کی وجہ سے ایرانیوں کی نسبت ان سے زیادہ قریب تھے۔

ایرانیوں کی فتح | لیکن ایرانی فوج نہایت طاقتور اور منظم تھی اور ادھر رومی فوج کا ایک بہترین جنرل نارسیس قسطنطنیہ کے بازار میں زندہ جلوا دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایرانیوں نے ایک طرف دجلہ و فرات کے کناروں سے شام کی طرف بڑھنا شروع کیا اور دوسری جانب ایشیا کوچک (میں) وہ آذربائیجان آرمینیہ ہو کر اناطولیہ میں داخل ہو گئے۔ رومی افواج کو دونوں طرف سخت ہزیمت اور پسپائی سے دوچار ہونا پڑا۔

یورپ کے مشہور مورخ گین کا بیان ہے کہ اس جنگ میں رومیوں کے نوے ہزار آدمی قتل ہوئے۔ کلیساؤں کو آگ لگا دی گئی۔ تین سو برس کی مذہبی ندریں ایک دن میں وقف عام ہو گئیں۔ انتہا یہ ہے کہ بیت المقدس سے عیسائیوں کی سب سے زیادہ مقدس صلیب بھی ایران کو منتقل ہو گئی اور قیصر روم ایک جبر بیجان ہو کر رہ گیا۔ مشرقی مالک کے نقصان کے علاوہ یورپ میں بھی ان کی حالت بہتر نہ تھی تمام یورپ میں غدر مچا ہوا تھا، اسٹریا (Istria) کی سرحد سے تھریس کی دیواروں تک آوارس (Avars) مظالم ڈھا رہے تھے۔ جنگ اطالیہ میں جن معصوم انسانوں کا خون پانی کی طرح بہا تھا وہ بھی ابھی خشک نہیں ہوا تھا کہ آوارس نے پنونیا (Pannonia) کے مقدس میدان میں مرد قیدیوں کو قتل کروا عورتیں اور بچے

غلام بنائے گئے رومی سلطنت قسطنطنیہ کی دیواروں، یونان اٹلی اور افریقہ کے کچھ بقیہ حصوں اور ایشیائی ساحل کے چند بحری مقامات میں صور سے طرازوں تک محدود ہو کر رہ گئی۔ فرض یہ ہے کہ ایک طرف عراق، شام، فلسطین، مصر اور ایشیا کوچک کے وسیع علاقوں میں ایرانی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ ہر جگہ آتشکدے تعمیر ہو رہے تھے اور مسیح کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کرائی جا رہی تھی اور دوسری طرف خود رومن امپائر کی وسیع مملکت میں بناوٹیں برپا تھیں اور ان بناوٹوں میں افریقہ اور یورپ کے علاقے بھی شامل تھے ظاہر ہے ان حالات میں سلطنت روم کے بے نام و نشان ہو جانے میں کیا کسر رہ گئی تھی۔

مشرکین کے کی مسرت | ان ایرانی فتوحات پر مشرکین کہ جتنے بھی خوش ہوتے کم تھا۔ وہ اس کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اپنے لئے فتح کی ایک نیک فال سمجھتے تھے اور مسلمانوں سے بر ملا کہتے تھے کہ جس طرح ایرانیوں نے رومیوں کو ہزیمتِ فاش دی ہے اسی طرح اگر کبھی تم میں اور ہم میں لڑائی ہوئی تو ہم کو بھی تم پر فتح حاصل ہوگی۔ مسلمان اس صورت حالات پر نہایت دل گرفتہ اور رنجیدہ تھے۔ مگر کر کیا سکتے تھے۔ راضی حکم ایزدی تھے کہ ناامیدی اور مایوسی کی شدید ترین ظلمتوں میں غلبہ روم کی آیات نے (جو پہلے گزر چکی ہیں) نازل ہو کر دلوں میں پھر امید و حوصلہ کی روشنی پیدا کر دی۔ کفار مکہ کا استبعاد اور اس کی وجہ | کفار مکہ کو اس پیشین گوئی کا علم ہوا تو انہوں نے اس کو نہایت مستعد سمجھ کر مسلمانوں کا مذاق اڑایا اور کہا کہ اچھا آؤ ہم تم شرط کریں کہ اگر رومی واقعی غالب آگئے تو ہم

لے گینے اپنی کتاب تاریخ زوال روم جلد ۳ میں ایران و روم کی اس جنگ کو نہایت تفصیل سے بیان کیا ہے اور وہ علامہ سید سلیمان ندوی نے سیرت النبی جلد ۳ میں اور ہمارے لائق دوست مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ایڈیٹر الندوہ نے الندوہ جلد ۲ نمبر ۵ میں گین کی تاریخ سے ہی اخذ کر کے اس جنگ کے منصل حالات لکھے ہیں ہم نے اس بحث میں ان دونوں مضامین سے استفادہ کیا ہے۔

مسلمانوں کو کئی اونٹ دینگے اور اگر اس کے برعکس ظہور ہوا تو مسلمان اونٹ ہار جائیں گے حضرت ابو بکرؓ نے مسلمانوں کی طرف سے اس پیشین گوئی کے ظہور کی مدت چھ سال مقرر کی تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو ارشاد ہوا کہ "یضع" کا لفظ تین سے نو تک پر بولا جاتا ہے اس بنا پر دس سال سے کم کی مدت مقرر کرنی چاہئے۔ حضرت ابو بکرؓ نے اس ارشاد نبوی کے مطابق نو سال کی شرط کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نظر بر اسباب ظاہری ان حالات میں کسی کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ ابھی چند برسوں میں ہی پانسہ بالکل مٹ جائے گا اور شکست خوردہ رومی پھر طاقتور ایرانیوں پر غلبہ حاصل کر لیں گے۔ کیونکہ ایک طرف ایرانی فتوحات اور طاقت و قوت کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے رومیوں کے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک چپہ چپین لیا۔ اور دوسری جانب قیصر روم ہرقل کی عیش پسندی اور غفلت مآبی کا یہ حال تھا کہ وہ گبن صاحب کے الفاظ میں پرے درجہ کا ست، کاہل، اور اپنی قوم اور ملک کی بربادی کا نامر و تماشائی تھا۔

"تاریخ زوال روما" کا مصنف لکھتا ہے:-

"محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند سال کے اندر اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہونگے۔ جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس وقت اس سے زیادہ بے نیاز قیاس کوئی بات نہیں کہی جاسکتی تھی۔ کیونکہ ہرقل کی حکومت کے ابتدائی بارہ سال سلطنت روما کی قریبی تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔

بہر حال یہ وہ نامساعد و ناموافق حالات تھے جن میں قرآن کی طرف سے غلبہ روم کی بظاہر بالکل مستبعد پیش گوئی کا اعلان عام کیا گیا۔ ترمذی میں ہے کہ حضرت ابو بکرؓ کو اس قدر خوشی ہوئی

۱۷ مترک حاکم جلد ۲ تفسیر سورہ روم و ترمذی باب تفسیر سورہ روم

کہ وہ مکہ کی گلیوں اور بازاروں میں حج حج کر الم غلبت الروم فی ادنی الارض وهم من بعد غلبہم سبغلبون کی تلاوت کرتے پھرتے تھے۔

پیشینگوئی کی صداقت کا ظہور | یہ آیت بعثت نبوی کے پانچویں سال نازل ہوئی تھی یعنی عیسوی تاریخ کے لحاظ سے ۶۱۴ء میں جبکہ ایرانیوں کے مقابلہ میں رومیوں کی شکست کا آغاز ہو چکا تھا۔ پھر ہوتے ہوتے ۶۱۶ء میں یہ شکست انتہا کو پہنچ گئی۔ آغاز شکست سے پورے آٹھ برس بعد یعنی ۶۲۲ء میں رومیوں کے تین مردہ میں پھر جان پیدا ہوئی اور انھوں نے ایرانیوں کے انتہائی جبر و ظلم سے تنگ آ کر ہر قتل کی قیادت میں ایرانیوں پر حملہ کر دیا۔ ۶۲۳ء سے انکو قرآن مجید کی پیشینگوئی کے مطابق اس حملہ میں کامیابی ہوئی شروع ہوئی اور انجام کار ۶۲۵ء میں رومیوں کی فتح اس شان سے پایہ تکمیل کو پہنچی کہ انھوں نے مشرقی مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا اور ایرانیوں کو باسفورس اور نیل کے کناروں سے ہٹا کر پھر وجہ و فرات کے ساحلوں تک دھکیل دیا۔ کیا عجیب بات ہے کہ ایرانیوں پر رومیوں کی حیرت انگیز فتح و کامرانی کا سال (بلکہ بعض روایتوں کے مطابق ہینہ اور دن بھی) بعینہ وہی سال تھا جس میں مسلمانوں کی تین سو تیرہ کی جماعت قلیل کو نو سو سے زیادہ مسلح کافروں کی بھاری تعداد کے بالمقابل بدر کے میدان میں عظیم الشان فتح حاصل ہوئی تھی۔

اب غور کرو، قرآن مجید نے غلبہ روم کی جو پیشینگوئی کی تھی اس میں چند باتیں خاص طور پر لحاظ کے قابل ہیں۔

(۱) یہ پیشینگوئی حد درجہ ناسازگار حالات میں کی گئی جبکہ رومیوں کی فتح کا بعید سا احتمال بھی نہیں ہو سکتا تھا۔  
 (۲) پیشینگوئی میں غلبہ روم کی کوئی طویل مدت مقرر نہیں کی گئی۔ بلکہ صرف نو سال بتائے گئے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ رومیوں کو جس شان کی شکست ہوئی تھی اس کے

اعتبار سے قیاس نہیں ہو سکتا تھا کہ وہ نو برس کی قلیل مدت میں اپنی عظمت رفتہ واپس لے لینگے  
(۳) پھر یہ دیکھو کہ رومیوں کو شکست جسُست اور عشرت پسند کمانڈر کے ہاتھوں ہوئی تھی  
اب یہ فتح بھی اسی کے زیر قیادت ہوئی ہے۔ گویا یہ وہ پہلا ہرقل ہے ہی نہیں۔

(۴) پیشنگوئی کے جو الفاظ ہیں نہایت واضح اور صاف صاف ہیں ان میں کاہنوں اور  
نجومیوں کی پیشنگویوں کی طرح ابہام و خفا یا شک و تردید کی ہلکی سی آمیزش بھی نہیں ہے۔ دیکھو  
کس حکم جزم و یقین کے ساتھ ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ لَا يَخْلِفُ اللَّهُ وَعَدَاً ۖ يَهْدِي اللَّهُ كَادِعْدَهُ ۖ اللَّهُ يَهْدِي اللَّهُ وَعَدَهُ كَاخْلَافِ

وَلَكِنَّ النَّاسَ لَا يَعْلَمُونَ (الروم) نہیں کرتا۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔

(۵) دنیا جانتی ہے کہ قرآن کی یہ حیرت انگیز پیشنگوئی کس طرح حرف پوری ہوئی  
اور ٹھیک اسی مدت میں جو قرآن نے مقرر کی تھی۔

اب خود سوچو اور بتاؤ کہ کیا قرآن کی یہ پیشنگوئی اور اس کا سچ ثابت ہونا قرآن کے اعجاز  
کی اور اس کے وحی الہی ہونے کی بین دلیل نہیں ہے؟ یہی وجہ ہے کہ اس پیشنگوئی کی صداقت  
کو دیکھ کر بہت سے کافر مسلمان ہو گئے۔

چند اور پیشنگوئیاں | اس خاص پیشنگوئی کے علاوہ قرآن مجید میں اور بھی پیشنگوئیاں ہیں جو  
بعد میں حرف پوری ہو کر رہیں۔ تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ جب مسلمان صلح حدیبیہ سے  
واپس لوٹے تو ان میں ایک عام بدولی پائی جاتی تھی اور وہ اس صلح کو اپنے لئے شکست کے مترادف  
سمجھتے تھے یہاں تک کہ بعض بعض نے تو صاف لفظوں میں اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ اس پر قرآن مجید  
نے یہ فرودہ جانفرا سنا یا۔

۱۶۱ ترمذی تفسیر سورہ الروم

إِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا

ہم نے تو تمہارے لئے عظیم الشان فتح مقرر کر دی ہے

اس آیت میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ حدیبیہ کی صلح کو شکست نہ کہو، بلکہ یہ درحقیقت پیش خیمہ ہے ایک عظیم الشان فتح کا جو فتح مکہ کے نام سے معروف ہو۔ چنانچہ اسی سورۃ میں ارشاد ہے۔

لَتَدْخُلَنَّ السَّبْعَ الْأَحْزَامَ إِنْ

تم اگر اللہ کے چاہا تو مسجد حرام میں ضرور داخل ہو گے

شَاءَ اللَّهُ أَمِنِينَ مُخْلَقِينَ رَوْحًا

امون و محفوظ کچھ اپنا سر منڈائے ہو گے اور کچھ

وَمُقَصَّرِينَ لَا تَخَافُونَ (الفتح)

بال ترشوائے ہوئے اور تم خوفزدہ نہیں ہو گے

پھر غزوہ خیبر میں مسلمانوں کو جو مال غنیمت ملا۔ اُس کے متعلق پیشینگوئی بھی اس آیت میں

پہلے ہی کر دی گئی تھی۔

سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انطَلَقْتُمْ إِلَى

بیچھے رہ جانے والے اعراب کہیں گے جبکہ تم مالہائے

مَعَانِمَ لَتَأْخُذُوا هَٰذَا زُرُونَا نَتَّبِعْكُمْ

غنیمت کو لینے جاؤ گے کہ تم ہم کو چھوڑ دو کہ ہم بھی

(الفتح)

تمہارے پیچھے بیچھے ملیں۔

فتح مکہ اور فتح خیبر کی پیشینگوئیوں سے زیادہ حیرت انگیز وہ پیشینگوئی ہے جس میں

مسلمانوں سے تمکن اور استخلاف فی الارض کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ

تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ

نیک عمل کرتے ہیں اللہ نے اُن سے وعدہ کیا ہو کہ وہ ضرور

فِي الْأَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِينَ

اُن کو زمین میں ایسا ہی خلیفہ بنائے گا جیسا کہ

مِنْ قَبْلِهِمْ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِينَهُمُ

اُن سے پہلے لوگوں کو بنایا ہے اور وہ یقیناً

الَّذِي ارْتَضَىٰ لَهُمْ

اُن کے اُس دین کو جس سے وہ (خدا) راضی

ہو گیا ہے طاقتور بنائے گا۔

(مومن)

یہ پیشینگونی اُس وقت کی گئی جبکہ عرب کے دونوں طرف ایران اور روم کی دوزبرد  
 سلطنتیں قائم تھیں، اس وقت کسی شخص کو یہ خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ چند برسوں میں ہی ایک  
 وقت وہ آئے گا جبکہ عرب کے بے سروسامان مسلمانوں کی ایک جماعت ان دونوں کو زیرِ زبر  
 کر کے رکھ دیگی لیکن اللہ وعدہ کر چکا تھا۔ اُس میں تخلص کس طرح ہو سکتا تھا۔ بالآخر دنیائے دیچھا کہ  
 کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے پچاس برس بعد ہی مسلمانوں نے ایک طرف ایرانی  
 سلطنت کی پُرانی حشمت و شوکت کو ختم کر کے رکھ دیا اور دوسری طرف مشرقی رومن امپائر کے  
 بہت سے صوبوں پر شام سے لے کر ہولندیش کے انتہائی سرے تک قبضہ کر لیا۔ رب العزت نے  
 مسلمانوں سے اختلاف فی الارض کا جو وعدہ کیا تھا وہ نصفِ صمدی میں ہی اس طرح پورا ہوا کہ خلافت  
 عظمیٰ کا دائرہ اقتدار مشرق میں سندھ تک پھیل گیا۔ مغرب میں بحرِ اٹلانٹک تک اور شمال میں سکا  
 پرچمِ عظمت اناطولیہ کے قلب و جگر پر لہرایا۔

مسلمانوں کی ان حیرت انگیز فتوحات پر تبصرہ کرتے ہوئے گبن صاحب قرآن کی پیشگوئی  
 کی صداقت کا اعتراف ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

”شاید اب قرآن کی تفسیر کنفورڈ کے اسکولوں میں پڑھائی جائیگی اور اُس کے ممبروں  
 سے مقدس لوگوں کے لئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم، کی وحی کی صداقت اور اُس کے تقدس کا اظہار  
 کیا جائے گا۔“

علاوہ ازیں یہ دیکھو کہ اللہ تعالیٰ نے

انما نحن نزلنا الذکر وانا لکما ہم نے ہی قرآن نازل کیا ہے اور ہم ہی اُس

محافظوں کی حفاظت کریں گے

۱ The Decline and Fall of Roman Empire

فرما کر قرآن کی حفاظت کا۔ اور

وَاللَّهُ لَيَصُبُّكَ مِنَ النَّاسِ  
اللہ تعالیٰ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

فرما کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کا جو وعدہ کیا تھا وہ کس طرح حرف بحرف پورا ہو کر رہا  
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دینے کے کیسے کیسے منصوبے باندھے گئے اور کیا کچھ سازشیں نہیں  
ہوئیں اور پھر آنحضرت مسلح فوجوں کی حفاظت میں یا کسی مضبوط قلعہ میں بھی نہیں رہتے تھے۔ لیکن  
چونکہ خدا وعدہ کر چکا تھا اس لئے دشمنوں کی تمام تدبیریں ناکام رہیں اور وہ آپ کا کچھ نہ کر سکے۔ اسی  
طرح قرآن کو دیکھو اس کو نازل ہوئے چودہ سو برس ہونے کو آئے اور اس کے باوجود اس کا حرف  
حرف بلکہ اعراب اور علامات آیات تک جوں کی توں محفوظ ہیں اور صرف کاغذوں میں نہیں بلکہ  
لاکھوں انسانوں کے سینوں میں کیا دنیا کی کوئی اور کتاب بھی اس طرح محفوظ ہے؟

اس اخبار بالغیب میں جو قرآن کے وجوہ اعجاز میں سے ایک وجہ ہے۔ قرآن مجید کے وہ  
قصص بھی داخل ہیں جو انبیاء کرام علیہم السلام یا دوسری اقوام سے متعلق ہیں اور منافقوں کے دلوں  
میں چھپے ہوئے ان بھیدوں کی اطلاع بھی داخل ہے جن کا ذکر زیادہ تر سورہ توبہ میں ہے۔  
فصاحت و بلاغت | قرآن مجید کے اعجاز کی ایک بڑی وجہ اس کا انتہائی فصیح و بلیغ ہونا ہے۔ اس کی  
تفصیلات میں اگرچہ اختلافات ہیں، لیکن اجمالاً یہ عقیدہ ہر قرن اور ہر دور میں جمہور امت کے نزدیک  
مسلم رہا ہے کہ قرآن کی فصاحت و بلاغت کا مثل نہیں لایا جاسکتا۔ قرآن نے خود اپنی فصاحت و  
بلاغت کا اظہار چند آیتوں میں کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

لِسَانَ الَّذِي يُلَيِّدُ وَكَانَ إِلَيْهِ الْعُجْحَىٰ  
جس کی طرف یہ کفار نسبت کرتے ہیں اس کی

وَهَذَا السَّانُ عَرَبِيٌّ مَبِينٌ  
زبان تو عربی ہے اور یہ قرآن کی زبان نہایت

واضح اور صاف عربی ہے۔ (نخل)



قرآننا عنریبا غیر ذی عوج (زمر) قرآن عربی زبان میں ہے جس میں کوئی کجی نہیں ہے  
 قرآن مبیناً نہایت واضح اور صاف قرآن  
 بلسان عربی صبین یہ قرآن ایسی زبان میں ہے جو مدعا کو وضاحت  
 سے بیان کرتی ہے۔

فصاحت و بلاغت ذوقی و وجدانی چیز ہے | اس بحث کے سلسلہ میں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین  
 کر لینی چاہئے کہ اگرچہ علماء معانی و بیان نے فصاحت و بلاغت اور ان کے مدارج و مراتب  
 کی تعین کے لئے بڑی محنت اور تلاش و جستجو سے اصول و قواعد مدون کئے ہیں اور ان کی تشریح  
 و توضیح میں نہایت طول طویل بحثیں کر کے ذہانت و طباعی کی داد دی ہے۔ لیکن اصل یہ ہے کہ  
 باعتبار فصاحت و بلاغت دو کلاموں میں موازنہ و ترجیح کا کام اہل سان کے ذوق و وجدان سے  
 ہی متعلق ہے۔ اور اس قضیہ میں ان کے ذوق کا فیصلہ ہی دلیل قاطع کا حکم رکھتا ہے۔ چنانچہ  
 کتاب الطراز کے مصنف فصاحت کلام پر طویل بحث کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

”یہ جو کچھ بھی ہم نے کہا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کسی لفظ کے حنث مالیف  
 کے فیصلہ کا دار و مدار ذوق سلیم اور طبع مستقیم پر ہے۔ قواعد و ضوابط پر نہیں جیسا کہ لوگوں نے سمجھا  
 ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ وہی چند حروف ہیں کہ اگر ایک خاص ترتیب سے ان سے ایک لفظ بنایا  
 جائے تو وہ انتہائی غیر فصیح اور رکبیک ہوتا ہے لیکن اگر انہیں حروف سے اس ترتیب کو بدل کر  
 کسی اور ترتیب سے ایک لفظ بنایا جائے تو وہ فصیح تر ہو جاتا ہے۔ مثلاً لفظ طلع اور علم“

جب خود اہل زبان بلاغت کا ذوق رکھنے میں یکساں نہیں ہوتے تو غیر اہل زبان کا تو  
 ذکر ہی کیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ قرآن کے وجود اعجاز کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں

لہ کتاب الطراز ج ۱ ص ۱۰۸ و ۱۰۹

ازاں جملہ درجہ علیا، از بلاغت کہ مقدور بشر نباشد و چون ابجد عرب اول آمدہ ایم کہنہ  
آن نمی توایم رسید۔ لیکن اس قدر می دانیم کہ استعمال کلمات و ترکیبات عذبہ جملہ، بالظاہر  
و عدم تکلف قدسے کہ در قرآن می یابم در پیچ قصیدہ از قصائد متقدمین و متاخرین نمی  
یابم و این امریت ذوقی کہ ہرہ از شعرا آرا بخوبی میتوانند دانست و عوام آن الفہ  
نہ از بندہ

اسی بنا پر امام راغب اصفہانی نے بالکل درست کہا ہے کہ جو لوگ وجدان صحیح اور ذوق  
سلیم رکھتے ہیں ان کے لئے اعجاز قرآن کی کسی دلیل کو پیش کرنے کی ضرورت نہیں وہ خود ہی  
اس کے قائل ہو جاتے ہیں ان کے برخلاف جو لوگ اعجاز قرآن کی دلیل کا مطالبہ کرتے ہیں وہ  
دو قسم کے اشخاص ہوتے ہیں ایک وہ جو ناقص ہونے کی بنا پر کلام الہی اور کلام بشری میں امتیاز  
نہیں کر سکتے اور دوسرے وہ جو نقص کے باوجود عناد بھی رکھتے ہیں۔

قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کا اندازہ ان لوگوں کو ہی ہو سکتا ہے جو سلامت ذوق  
اور استقامت طبع کے ساتھ عرب کے اساتذہ شعر و سخن کے کلام کا مطالعہ کئے ہوئے ہوں اور جنہوں  
نے علم معانی و بیان پر اساتذہ متقدمین کی کتابوں کا مطالعہ کر کے اپنے ذوق و وجدان کو پختہ اور  
شائستہ بنا لیا ہے۔

۱۔ کتاب الذریعہ ص ۷۰

۲۔ الفوز الکبیر ص ۳۸

۳۔ ہا سے ہندوستان کے ماہر عربیہ میں ان نمونہ کی جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ اس مقصد کے لئے بالکل ناکافی  
ہیں ان کی جگہ اگر کتب ذیل پڑھائی جائیں تو خاطر خواہ فائدہ ہو سکتا ہے (۱) اسرار البلاغۃ و دلائل الامجاز امام  
جدد القاہرہ جرجانی (۲) کتاب الضاعتین ابو ہلال العسكري (۳) المختصر ابن جنی (۴) اساس البلاغۃ زعمشری  
(۵) کتاب الطراز یحییٰ بن حمزہ (۶) کتاب الفوائد حافظ ابن قیم (۷) منی البیب ابن ہشام

بلغار و شعراء عرب پر قرآنی بلاغت کا اثر جو لوگ اس نعمتِ خداداد سے بہرہ وافر رکھتے ہیں وہ خواہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم بہر حال اس پر مجبور ہیں کہ بلاغت و فصاحت کے اعتبار سے بھی قرآن کے اعجاز کے قائل ہوں۔ چنانچہ تاریخ ادبیات عرب کا مطالعہ کیا جائے تو اس قسم کے صدہا واقعات ملتے ہیں کہ لوگوں نے قرآن مجید کی ایک آیت سنکر ہی اُس کے وحی الہی ہونے کا اقرار کر لیا ہے۔

عقبہ بن ربیعہ قریش کا بڑا صاحب اثر و درویش شخص تھا۔ بدر کی جنگ میں مارا گیا ہے ایک مرتبہ اہل قریش کے ساتھ ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم الگ مسجد میں تشریف رکھتے تھے۔ عقبہ اہل مجلس کے مشورہ کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور وہ یہ تھا کہ آپ کو مال وغیرہ کا لالچ دے کر دعوتِ اسلام سے باز رکھنے کی کوشش کرے عقبہ اپنی تقریر ختم کر چکا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حمد تنزیل من الرحمن الرحیم کی سورہ کا کچھ حصہ تلاوت کر کے سنا یا۔ عقبہ نے اپنے دونوں ہاتھ پس پشت لیجا کر ان پر ٹیک لگالی اور نہایت خاموشی سے سنتا رہا۔ سورہ کی تلاوت کرتے کرتے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آیت سجدہ تک پہنچے تو آپ نے سجدہ تلاوت کیا۔ اور پھر عقبہ سے مخاطب ہو کر فرمایا: ابوالولید! کیا اب بھی تم اپنے اسی پرانے خیال پر جمے ہوئے ہو؟ عقبہ یہ سنکر اپنے لوگوں میں واپس چلا آیا۔ لیکن قرآن مجید کی آیات کو سننے کا اثر اُس کے چہرہ بشرہ سے ظاہر ہو رہا تھا۔ اسباب مجلس نے جب اس سے پوچھا تو کہنے لگا:۔۔۔ خدا کی قسم! میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ اُس جیسا آج تک سنا ہی نہیں تھا۔ بخدا! یہ کلام ہرگز ہرگز نہ شعر ہے نہ کوئی جادو ہے اور نہ کسی کا ہن یا بخومی کا قول ہے۔ اسے قریشیوں نے تم میری بات مانو!

انہیں قبیلہ غفار کے بڑے نامور شاعر تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا سنکر

چھٹے چوہی مکہ آتے اور آنحضرت کی زبان مبارک سے قرآن مجید کی کچھ آیتیں سُکر داپس گئے۔ ان کے بھائی حضرت ابو ذر نے پوچھا کہ تم نے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو کیسا پایا؟ وہ بولے، "لوگ کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں، ساحر ہیں یا کاہن ہیں، لیکن میں نے کانہوں کا کلام سنا ہے اور شعر کے اسالیب و طرق سے بھی واقف ہوں، میں نے محمد کے کلام کو ان سب پر منطبق کر کے دیکھا۔ خدا کی قسم! وہ ان سب سے بالکل الگ اور ایک اور ہی عجیب طرح کا کلام ہے۔ بخدا! محمد سچے اور قریش کے لوگ جھوٹے ہیں۔"

ولید بن مغیرہ بڑا دولت مند اور قریش میں فصاحت کا امام تھا ایک مرتبہ اس نے خدمت نبوی میں حاضر ہو کر کچھ سنانے کی درخواست کی۔ آنحضرت نے ان اللہ یا ہر بالعدل الی آیت آخر تک تلاوت فرما کر سنائی۔ ولید اس درجہ متاثر ہوا کہ اُس نے کمر تلاوت کرنے کی فرمائش کی جب آنحضرت دوسری مرتبہ بھی سنا چکے تو ولید بولا "خدا کی قسم اس کلام میں کچھ اور ہی شیرینی ہے اور تازگی بھی نئی قسم کی ہے۔ اس نخل کا اعلیٰ حصہ ثمر آور ہے اور اس کا حصہ زیرین مضبوط ترنہ ہے۔ اور کوئی بشر اس جیسا کلام نہیں کر سکتا۔"

شاہِ جلس کے متعلق مشہور ہے ہی کہ جب اُس کے دربار میں حضرت جعفر نے سورہٴ مریم کی تلاوت کی تو وہ اس درجہ متاثر ہوا کہ بیاختہ آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے، پھر بولا "خدا کی قسم! یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔"

قبیلہ اُرُوک کے ایک شخص ضاد تھے جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے۔ ایک مرتبہ مکہ آئے اور یہاں کے لوگوں سے سنا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو (نوذ باللہ) جنون ہو گیا ہے۔ ضاد یہ خیال

۱۵ شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۰

۱۵ صحیح مسلم اسلام ابی ذر

۱۵ مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰

کر کے کہ میں آپ کا علاج کروں گا۔ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آنحضرت نے ان کے سامنے مختصر سی حمد اور کلمہ شہادت پڑھا، خدا پر اس کا بہت گہرا اثر ہوا اور تین مرتبہ آپ سے اس کا اعادہ کر آیا اور پھر کہا ”میں نے کاہنوں، جادو گروں اور شاعروں ان میں سے ہر ایک کا کلام سنا ہے لیکن آپ جیسے کلمات تو سنے ہی نہیں، یہ کلام تو سمندر کی گہرائیوں تک اتر جائیگا“ اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ اقدس پر بیعت کر لی۔

عمر بن جحوح قبیلہ بنو سلمہ کے نامی گرامی سردار تھے ان کے بیٹے معاذ اسلام قبول کر کے واپس آئے تو انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پوچھا کہ تم نے آپ سے کیا سنا ہے؟ معاذ نے سورہ فاتحہ امجد شہد رب العالمین سے لیکر الصراط المستقیم تک پڑھ کر سنائی۔ عمر بن جحوح پر بڑا گہرا اثر پڑا، کہنے لگے ”یہ کلام تو بڑا ہی عمدہ ہے اور خوب ہے کیا آپ کا سب کلام ایسا ہی ہے؟“ بولے ”جی ہاں! بلکہ اس سے بھی عمدہ“ اس کے بعد وہ مسلمان ہو گئے۔

جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا عرب کا بچہ بچہ شعر و شاعری کا ذوق خدا اور رکھتا تھا۔ آتش بیان خطباء قبیلہ قبیلہ میں موجود تھے جو کسی بڑے سے بڑے شاعر و خطیب کے کلام کو نظر میں نہیں لاتے تھے۔ فصاحت و بلاغت کا جوہر ایک ایک شخص کے خمیر میں پڑا ہوا تھا اور وہی ان کے لئے سب سے بڑا سرمایہ نازش و افتخار تھا۔ اب غور کرو فصاحت و بلاغت اور شعر و خطابت کی اس گرم بازاری کی عہد میں مکہ کی خاک پاک سے ایک نبی امی کا ظہور ہوتا ہے۔ وہ چالیس سال تک خاموش زندگی بسر کرنے کے بعد یکایک ایک نئے پیغام کی دعوت لیکر اٹھتا ہے اور اس دعوت کی سچائی کے ثبوت میں ایک کلام (قرآن) پیش کرتا ہے۔ اس کلام کو پیش کر کے وہ عرب

صحیح مسلم باب الاقتصاد فی الصلوٰۃ والنخبۃ

۱۰۲ شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۲

کے نامور شاعروں، شعلہ فشاں مقرروں، اور خطیبوں، اور میدان فصاحت و بلاغت کے شہسواروں کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ بار بار، نرمی اور لہجے سے نہیں بلکہ نہایت سخت زبرد تو بیخ کے انداز میں پھر کیے بعد دیگرے نہیں بلکہ سب کو ایک ساتھ چیلنج دیتا ہے کہ اگر یہ لوگ اُس کے دعویٰ کی تکذیب میں سچے ہیں تو سارے قرآن کا نہیں اُس کے کسی ایک جز کا ہی مثل لا کر دکھا دیں!

پھر کیا حقیقت نہیں کہ اس نبی امی کی مخالفت اور خصومت میں کیا کچھ نہیں کہنا اور کیا گیا لیکن یہ عرب کے نامور خطبار اور شعرا سب مل کر بھی قرآن مجید کی تحدی کے جواب میں اُس کی کسی ایک سورۃ کا مثل لاسکے، ہرگز نہیں، سب کی زبانیں گنگ تھیں۔ اور قوت فصاحت و بلاغت مغلوب، پھر جو لوگ ان میں پاک باطن اور صاف سینہ تھے انہوں نے کھلے لفظوں میں اپنی شکست و عجز کا اقرار کیا اور قرآن کے اعجازِ بیان سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے شاعری کو ہی خیر باد کہہ دیا۔ بے حد عرب کے مشہور شاعر ہیں جن کا ایک قصیدہ سب سے متعلقہ میں بھی شامل ہے، اسلام قبول کرنے کے بعد انہوں نے شعر کہنا بالکل ترک کر دیا تھا۔ صرف ایک دو شعر منقول ہیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے اُن سے شعر سنانے کی فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا: "جب خدا نے مجھ کو بقرہ اور آل عمران سکھائی تو اب مجھے شعر کہنا موزوں نہیں" ان کے علاوہ حسان بن ثابت کعب بن مالک، عبداللہ بن رواحہ، طفیل بن عمرو، زید الخلیل، کعب بن زہیر، شمس، ابو دین سریع وغیرہم عرب کے نامی گرامی شعراء تھے لیکن قرآن مجید کے دعویٰ اعجاز کے سامنے سب کی گردنیں خم ہو گئیں اور بجائے مخالفت ہونے کے اسلام کے زبردست حامی بن گئے

قرآن مجید کے اعجازِ بیان کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی صاحبِ ذوق کے سامنے اسکی کوئی آیت تلاوت کی جائے اور اُسے یہ معلوم نہ ہو کہ اس کلام کا قائل کون ہے تب بھی لامحالہ سننے والے پر

اس کا اثر ضرور ہوگا۔ تاریخ اور ادب کی کتابوں میں جستجو کی جائے تو اس قسم کے سینکڑوں واقعات مل سکتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اعرابی نے ایک شخص سے فاصد ۶ بنا تو ہر سنا تو فوراً سر بسجود ہو گیا اور بولا۔ میں نے اس وقت اس کلام کی فصاحت و بلاغت سے ہمیت زدہ ہو کر سجدہ کیا ہے ایک اعرابی نے کسی شخص سے قرآن پاک کی آیت فلما استیأسوا منه خلصوا نجیاً سنی تو بولا میں گواہی دیتا ہوں کہ کوئی مخلوق اس جیسا کلام بولنے پر قادر نہیں ہے۔

ایک دفعہ عربی لغت کے مشہور امام اصمعی نے ایک کسن سچی کو دوشعر پڑھتے ہوئے سنا شعر سکر بولے۔ التد اکبر ایہ شعر کس درجہ فصیح و بلیغ ہیں، بلڑ کی بولی۔ کیا اللہ تعالیٰ کے ارشاد

واوحینا الی اُمّ موسیٰ ان اد <sup>ضعیبا</sup> اور ہم نے موسیٰ کی ماں کو وحی بھیجی کہ تم اس کو

فاذا خفت علیہ فالقیما فی دودھ پلاؤ اور جب تم کو اس کے متعلق خوف

الیم ولا تخافی ولا تحذنی انا ہو تو اس سے دریا میں ڈال دو اور نہ خوف کرو

داؤد وک الیک وجاعلوا من نہ غم، ہم پھر موسیٰ کو تمہاری طرف لٹا دیں گے

المسلین اور اس کو رسول بنا دیں گے۔

کے بعد بھی کوئی کلام اب اسکا متحق ہے کہ اسے فصیح کہا جائے۔ تم دیکھتے نہیں کہ اس ایک آیت میں

میں کس خوبی سے اللہ نے دو امر اد اضعیبا اور القیما دوہنی کا لا تخافی ولا تحذنی، دو خبریں

انار اؤد وک اور جاعلوا اور دو بشارتیں جمع کر دی ہیں

ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ حضرت عمرؓ مسجد نبوی میں سو رہے تھے کہ اتنے میں روم کی فوج

کا ایک کمانڈر انچیف آیا اور کلمہ تشہد پڑھنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کا سبب پوچھا تو اس نے

جواب دیا کہ میں نے مسلمان قیدیوں سے ایک قیدی کی زبانی یہ آیت سنی ومن یطعم اللہ

وَرَسُولُهُ وَمَخِشَ اللَّهُ وَيَتَّقَهُ الْآيَةَ اور اس سے اس درجہ متاثر ہوا کہ آپ کے سامنے اسلام قبول کرتا ہوں۔

ان واقعات کے علاوہ صحابہ کرام کے حالات زندگی پڑھو تو معلوم ہو گا کہ قرآن مجید ان پر کیا اثر کرتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے متعلق کون نہیں جانتا کہ انھوں نے اپنی بہن فاطمہ سے سورۃ بسم اللہ مافی السموات والارض سنی تو یہ حال ہوا کہ یا تو سخت غصہ میں بھری ہوئی تھی اس صورت کو سنتے ہی ان کا حال دکرگوں ہو گیا۔ ایک ایک لفظ دل پر تیر و سناں کا کام کرتا تھا۔ یہاں تک کہ جب فاطمہ آمنوا باللہ ورسولہ پر پہنچی تو وہ بے ساختہ پکار اٹھے اَشْهَدُ اَنْ لَا اِلَهَ اِلَّا اللهُ وَاشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللهِ

حضرت عثمان بن مظعون نے جب سورہ نحل کی یہ آیت سنی

اِنَّ اللّٰهَ يَاصِّرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ بے شبہ خدا عدل اور احسان اور قرا بہداروں  
وَايتَاءِ ذِي الْقُرْبٰى وَنِيْهِىْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْبغىٰ لِعِظَمِ  
تاکہ تم اس سے نصحت پذیر ہو۔

تو انھوں نے فرمایا "اب اس وقت میرے دل میں ایمان جاگزیں ہو گیا اور میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے لگا۔"

حضرت جبیر بن مطعم اسیران بدر کو چھڑانے آئے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے سورہ طور کی چند آیتیں سنی تو ان کا دل اڑنے لگا، حضرت طفیل بن عمرو دوسی کے کانوں

۱۔ یہ سب واقعات شرح زرقانی ج ۵ ص ۱۰۳ و ۱۰۴ سے ماخوذ ہیں

۲۔ صحیح بخاری تفسیر سورہ طور

۳۔ مسند امام احمد بن حنبل ج ۱ ص ۳۱۸



میں اتنا فیہ قرآن کی چند آیتیں پہنچ گئیں تو حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ جس سے ہمیں آدمیوں کی ایک جماعت خدمت اقدس میں حاضر ہوئی آپ نے ان کو قرآن مجید کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا تو ان کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے، طاقت کے سفر میں حضرت خالد العدوانی نے آپ کی زبان سے

والسماء والطارق  
آسمان کی قسم اور رات میں آنے والے

کی قسم

سنی تو اسی وقت پوری سورۃ دل میں اترتی چلی گئی اور آپ مسلمان ہو گئے۔

افراد و اشخاص کا کیا ذکر ہے صحابہ کی تو جماعت کی جماعت ہی قرآن مجید کو اثر سے متاثر ہوئی۔ حضرت ابو عبیدہؓ اور حضرت ارقم بن ابی ارقم اسی کتاب الہی کی متناطیسی کشش سے کھنکھرا کر اسلام لائے تھے۔

پھر اسلام لانے کے بعد بھی صحابہ کا یہ حال تھا کہ ایک ایک آیت پر کلام الہی کی ہیبت سے آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی جو خود حامل وحی تھے بسا اوقات کسی کی زبان سے قرآن مجید سن کر رونے لگتے تھے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے قرأت شروع کی تو چشم مبارک سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے۔

قرآن کی یہ معجزانہ فصاحت و بلاغت ان لوگوں کو بھی متاثر کئے بغیر نہ رہی جو اہل زبان

۱۔ طبقات ابن سعد تذکرہ طفیل بن عمرو الدوسی

۲۔ سیرۃ ابن ہشام

۳۔ مسند امام احمد بن حنبل ج ۲ ص ۳۳۵

۴۔ اسد الغابہ تذکرہ ابوسلمہ

نہ تھے۔ اور ساتھ ہی غیر مسلم بھی تھے، ڈاکٹر ٹیلر، موسیو سد یو، گن۔ ڈیون پورٹ، ہاسٹائی، کارلائل، ہنری دی کاسٹری۔ راڈویل ان لوگوں نے بھی قرآن مجید کے اسلوب بیان اور اس کی تاثیر و تسخیر کا اعتراف صاف لفظوں میں کیا ہے۔

ژان تراک روسو نے اپنی ایک تحسیر میں قرآن مجید کی تاثیر اور اس کے اعجاز کا ذکر ایک عجیب پیرایہ میں کیا ہے جو آج کل کے بعض مدعیان عربی دانی پر پورے طور پر صادق آتا ہے وہ لکھتا ہے:-

بعض لوگ ہیں جو عربی برائے نام ہی جانتے ہیں وہ جب قرآن پڑھتے ہیں تو ہنسنے لگتے ہیں۔ لیکن اگر اس قسم کے لوگوں کو اس بات کا موقع مل جاتا کہ وہ براہ راست محمد صلی اللہ علیہ وسلم اسوں حد درجہ اثر انگیز اور دلوں میں گھر کرنے والی زبان کو سنتے تو بے شبہ یہ لوگ زمین پر سجدہ میں گر پڑتے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پکار کر کہتے کہ "اے نبی! آپ ہمارا ہاتھ پکڑ لیجئے۔ پھر آپ کا جہاں جی چاہے ہم کو لے چلئے۔ خواہ شرف و مجد کی طرف یا خطروں اور ہلاکتوں کی جانب۔ ہم تو اب آپ کی وجہ سے موت کو بھی محبوب رکھنے لگے ہیں۔"

عدم اختلاف قرآن نے اپنے اعجاز کی ایک دلیل عدم اختلاف و تناقض کو بھی بیان کیا ہے ارشاد ہے:-

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا  
اس میں بہت زیادہ اختلاف پاتے۔

عام مضمین کی بڑی بڑی اہم تصنیفات سے قطع نظر یہ دیکھو کہ دوسرے مذاہب کی

۱۵ دیکھو تفصیل کے لئے الاسلام و الحضارة العربیہ جلد اول اور ادب العرب

۱۶ بحوالہ الاسلام در الحضارة العربیہ ج ۱ ص ۶۹

خود الہامی اور آسمانی کتابوں کا حشر ہوا؛ ایک اڈیشن دوسرے اڈیشن سے مختلف ہے لیکن قرآن نے اپنی صداقت میں جس دلیل کو پیش کیا تھا۔ وہ دشمنوں کی ہزار کوششوں کے باوجود آج تک آفتاب نیروز کی طرح روشن و ظاہر ہے تقریباً تیس بتیں برس پہلے ڈاکٹر منگنمان نے قرآن مجید کے کسی نئے نسخے کے طے کی اطلاع سے دنیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا تھا۔ لیکن باخبر اصحاب کو معلوم ہے کہ مصر اور ہندوستان کے علماء نے کس طرح ڈاکٹر صنایک کے بے بنیاد دعویٰ کو باطل محض کر دکھایا تھا

**احکام و شرائع** | خود قرآن کے بیان کے مطابق اُس کے اعجاز کی ایک وجہ اُس کے تشریحی احکام و مسائل ہیں قرآن نے بار بار اپنے آپ کو ہدایت۔ نور۔ دلیل روشن۔ رحمت۔ بصیرت اور حجت کہا ہے۔ غور کر و قرآن مجید کے اعجاز کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ چالیس سال کی خاموش زندگی کے بعد یکایک ایک اُمّی ایک صحیفہ مقدس لئے ہوئے دنیا کے سامنے ظاہر ہوتا ہے اور اس صحیفہ سے وہ جاہلوں کو دانشورانِ روزگار اور اونٹ چرانے والے برویوں کو بہترین تہذیب و تمدنِ اخلاق فاضلہ اور اعمالِ صالحہ کا سپیکر قائم بنا دیتا ہے۔ اصولِ اخلاق و قانونِ حکمت و فلسفہ اور محاسنِ علم و عمل کی بزم کا گوشہ گوشہ اس کے پر تو قدس سے بقوم نورین جاتا ہے

**قرآن کا حکم دستورِ عمل** | جو قوانین و ضوابط قرآن نے پیش کئے وہ اس قدر صحیح اور مکمل ہیں کہ آج علوم و فنون کی بڑی گرم بازاری اور انسانی عقل و خرد کی حیرت انگیز ترقی و بلند پروازی کے باوجود معاشرت، تہذیب و تمدنِ نکاح و طلاق۔ بیع و شرا۔ تقسیم میراث اور عام معاملات و اخلاق کے قوانین قرآنی قوانین کے مقابلہ میں سالہا سال کے تجربوں کے بعد نا کام ہی ثابت ہوئے ہیں وہی وجہ ہے کہ دوسری قوموں کو جب کبھی اپنی سوشل اصلاح کا خیال پیدا ہوا۔ انھوں نے اپنی پرانی مزعومہ یا اصلی روایات مذہبی کو چھوڑ کر اسلام کے احکام و قوانین کے دامن ہی میں پناہ لی ہے۔

اس پر اگر تفصیل سے کلام کیا جائے تو ایک مستقل کتاب درکار ہو جیسا کہ اس قدر لکھ دینا کافی ہو گا کہ

یورپ کے بہت دنوں تک طلاق کا مذاق اڑایا۔ تعدد ازدواج پر طعنہ زنی کی۔ اور مسلمانوں کے جہاد کو وحشت اور بربریت کہا۔ مگر آخر کار اسکو خود طلاق کا قانون وضع کرنا پڑا۔ پھر یہ دیکھو کہ اسلام نے طلاق کا اختیار مرد کو دیا تھا نہ کہ عورت کو۔ کیونکہ عورت فطرتاً بہت زودرنج اور جلد متاثر ہو جاتی ہے۔ یورپ والوں نے طلاق کو مشروع تو کیا لیکن غلطی یہ کی کہ اسکا اختیار عورت کو دیدیا۔ گویا پہلے یہ لوگ تفریط میں مبتلا تھے اور اب افراط میں مبتلا ہو گئے۔ اسکو کچھ بھی نتیجہ ہوا آج ہر باخبر شخص اس سے ناواقف نہیں ہے کہ طلاق کی کثرت نے کس طرح ان لوگوں کی معاشرتی زندگی ویران و تباہ کر رکھی ہے۔

ہندوؤں میں عقیدہ بیوگان کا رواج نہیں تھا۔ مذہبی اعتبار سے وہ اسے بہت بڑا پاپ سمجھتے تھے۔ لیکن جب اس ممانعت کی سوسائٹی میں چند در چند اخلاقی معائب پیدا کر دیئے اور انکو اپنی اصلاح کا خیال ہوا تو انجام کار انھیں وہی کرنا پڑا جسکا اعلان اسے ساٹھ تیر سو سال سے بھی زیادہ مدت پہلے ایک نبی امی کی زبان سے ہو چکا تھا۔ یہی حال میرٹ کا ہے۔ ہندوؤں میں بیٹی کو ترکہ پوری سے کوئی حصہ نہیں ملتا تھا۔ لیکن اب جن ہندو ریاستوں میں سماجی اصلاح کی کوششیں ہو رہی ہیں ہاں بر ملا کہا جا رہا ہے کہ بیٹی کو بھی حصہ ملنا چاہئے اب اسپر بھی غور کرنا چاہئے کہ قانون قرآنی کے تناسب و متوازن ہونیکا یہ عالم ہے کہ وہ بیٹی کو باپ کے ترکہ میں حصہ دلاتا ہے لیکن بیٹے سے نصف، اس میں حکمت یہ ہے کہ بیٹے کو کسب معاش کے لئے کارگاہ زندگی میں تگ و دو کرنی پڑتی ہے اور تمام بار اس کو ہی اٹھانا پڑتا ہے، رہی بیٹی تو اسکو کمانے کیلئے خود کچھ نہیں کرنا پڑتا بلکہ اس کا نان نفقہ شادی کے بعد شوہر کے ذمہ ہوتا ہے۔

یورپ کے تعدد ازدواج پر کیا کچھ لعن طعن نہیں کیا۔ لیکن اب وہاں کے بڑے بڑے حکماء اور مفکرین تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام میں تعدد ازدواج کی اجازت بہت اخلاقی فواحش و مفاسد کے انسداد کا کامیاب ذریعہ ہے۔ اسی طرح یورپ کے "جہاد" کو وحشت اور درندگی کہا۔ لیکن اب دیکھو کہ خود یورپ میں کیا ہو رہا ہے کیا اسے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اب وہی زبان سے یورپ کے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا ہے کہ جب تک دنیا فتنہ و شر اور خواہشات نفسانی

و اغراض فاسدہ کی آماجگاہ ہو کسی حق کی حفاظت کیلئے تلوار سو کام لینا ناگزیر ہو۔ البتہ ہاں فرق استدر ضرر ہے کہ قرآن میں جس جنگ کا حکم ہو وہ وہی جنگ ہو جو حق کی حمایت و حفاظت کیلئے لڑا ہی جائے نسلی اور قومی عصبیت کی برتری قائم رکھنے کیلئے جنگ نہ صرف یہ کہ جائز نہیں ہو بلکہ بہت بڑی محصیت ہو اور یہاں انجیل کے پیر و چوکچہ کر رہے ہیں وہ محض اپنی قومی فوقیت کو برقرار رکھنے اور دوسری ملکوں اور قوموں کو اپنی دام حکومت میں پھنسانے کیلئے کر رہے ہیں۔ پس غور کرو کہ کیا یہ قرآن کا اعجاز نہیں ہے کہ وہ جو دستور العمل اور نظام زندگی پیش کرتا ہے وہ ایسا جامع محکم اور ناقابل تغیر و تبدل ہے کہ صدیوں گزر جانے اور عقل و فکر کی حیرت انگیز ترقی کے باوجود اسکی کسی ایک نمہ میں بھی کوئی ترمیم و تیسخ نہیں ہو سکتی۔ اور اس بنا پر مسلمان اس بات کے محتاج نہیں ہیں کہ اپنی کسی سوشل اصلاح کیلئے وہ کسی دوسرے قانون نظام سے وریوزہ گری کریں تاہم شاہد ہے کہ جب کبھی کسی جماعت نے قرآن کے دستور سے منحرف ہو کر کسی قوم کی نقالی کی اس نے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں۔ اسکے برعکس دوسری قوموں کا حال یہ ہے کہ وہ اپنی سوسائٹی کی اصلاح کیلئے جب کبھی غور و فکر سے کام لیتی ہیں انھیں مجبوراً اپنی دیرینہ روایات مذہبی و سماجی کو پس پشت ڈال کر اسلام کے دستور سے ہی بھیک مانگنی پڑتی ہے۔ پس کیا کوئی طاقت ہے جو قرآن کے دعویٰ

کتاب اُحکمت آیاتہ ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط ہیں

اور جلنا لہ نوراً نھدی بہ من نشاء ہم نے اسکو نور بنایا ہے کہ جسکو چاہتے ہیں اسکے

ذریعہ سے راستہ دکھاتے ہیں

کی ذرا بھی تکذیب و تغلیط کر سکے، سورہ قصص میں قرآن مجید اپنی اس حیثیت کو بطور تحدی اس طرح بیان کرتا ہے

قل فاتوا بکتاب من عند اللہ کہدیکھے لے محمد اتم اللہ کے پاس سے کوئی ایسی

کھواھدی منہما اتبعما ان کنتم کتاب آکوجوان دونوں (قرآن اور توراہ)

صادقین سے زیادہ ہدایت دینے والی ہو۔ میں اس کا

تبع کرے گا اگر تم سچے ہو

قرآن کی طرح سے تشبیہ | جیسا کہ شروع میں بیان کیا گیا ہے۔ قرآن مجید سزا پانور اور حسن و جمال ہے بطور بالا میں جو چند وجوہ اعجاز بیان کئے گئے ہیں وہ صرف اُس کے ایک بُخ پر نوز کی ناتمام سی تشریح کرتے ہیں غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کو ایک مقام پر روح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ارشاد ہے

وَكذٰلِكَ اَدۡخِلۡنَا الۡبَیۡتَ رُوحًا ۝۱۰۱ اور اسی طرح ہم نے اپنے حکم سے آپ پر روح کو  
من امرنا (ذخرت) بطور وحی نازل کیا۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس طرح روح ایک حقیقت ثابتہ ہے اُس کے افعال و آثار ہر شخص پر عیاں ہیں اور یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ مادی اور جسمانی زندگی کا قیام روح کے اتصال بالجسم پر موقوف ہے۔ لیکن اسکے باوجود آج تک روح کی حقیقت و ماہیت متعین نہیں کی جاسکی۔ اسی طرح قرآن مجید اخلاق و حسن عمل کی روح ہے اس پر عمل کرنے کے بعد ہر شخص اس کے اثرات و نتائج میں طور پر محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن باہم کوئی شخص اُس کی پوری حقیقت و کمنہ سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتا۔

حضرت علیؓ کا ارشاد | حضرت علیؓ نے قرآن مجید کی نسبت ایک نہایت پینغ کلام کیا ہے ہم وجوہ اعجاز کی بحث کو اس پر ہی ختم کرتے ہیں۔

”قرآن علماء کی پیاس کیلئے سامان سیرابی ہے اور فقہاء کے دلوں کے لئے فصل بہار، وہ صلیحاری کیلئے ایک جاوہر متقیم ہے اور ارباب بحث و نظر کیلئے برہان قوسی، وہ طلبہ علوم کیلئے علم کا انمول خزانہ ہے اور ارباب حکومت کے واسطے ایک حکم دستور اساسی، وہ اصحاب روایت کے لئے حدیث جانفراہی اور تشنگانِ تحقیق و جستجو کے لئے اُمید ورجار کا سب سے بڑا سہارا (بیج البلاغہ)

حق کی حجت تمام ہو چکی، اب اس پر بھی اگر کوئی سرگشتہ و ادوی ضلالت و گمراہی ہدایت کی روشنی نہیں پاتا تو نہیں کہا جاسکتا کہ

نبایٰ حدیثاً بعداً یؤمنون اس کے بعد وہ کس بات پر ایمان لائیں گے

مفصل کتابیں موجود ہیں۔

یہاں یہ جوادینا فروری ہے کہ ہم نے کتاب کے موضوع بحث کی مناسبت سے اعجاز قرآن پر مختصر گفتگو کی ہے۔ درنہ اس بحث کے لئے ایک مفصل ضخیم کتاب درکار ہے عربی میں خاص اسی موضوع پر لکھی عمدہ اور

## قرآن مجید کا اسلوب بیان اور بعض عیسائی مصنفین

کتاب کے آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بعض ان اعتراضات اور انکے جوابات کا بھی ذکر کر دیا جائے جو بعض عیسائی مصنفین نے قرآن پر کئے ہیں۔ ان لوگوں کا ایک عام اعتراض یہ ہے کہ نزول قرآن سے پہلے عرب میں بعض پر زور خطیب مثلاً قس بن ساعدہ، اور شعراء مثلاً امیہ بن الصلت ایسے موجود تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت سے پہلے انکے خطبے اور اشعار سنے تھے۔ اور ان لوگوں کے کلام میں بعض چھوٹے چھوٹے فقرے قرآن کی چھوٹی چھوٹی آیتوں کے انداز کے پائے جاتے ہیں، عیسائی مصنفین اسے نتیجہ نکالتے ہیں کہ دلوذ باللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کا اسلوب انہیں سے لیا ہے قس بن ساعدہ کے خطبات، اور امیہ بن الصلت کے اشعار عربی ادب و محاضرات کی کتابوں میں بکثرت منقول ہیں انکی طرف مراجعت کی جاسکتی ہے یہاں انکے نقل کرنیکی ضرورت نہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں سب سے پہلے یہ معلوم کر لینا چاہئے کہ قس بن ساعدہ اور امیہ کے جن اشعار کو پیش کر کے قرآن مجید کے اسلوب پر اعتراض کیا جاتا ہے ان کی نسبت تحقیق یہ ہے کہ وہ سب موضوع ہیں۔ اس بنا پر وہ نزول قرآن سے پہلے کا نہیں بلکہ بعد کا کلام ہے اصل یہ ہے کہ نبی امیہ اور عباسیہ کے عہد میں کچھ ایسے لوگ تھے جو خلفاء و امراء سے پیش از پیش انعام حاصل کرنے اور بعض دوسری اغراض کیلئے از خود کلام گھر گھر کر شعراء و خطباء جاہلیت کی طرف سے منسوب کر کے سنا دیتے تھے۔ ان وضاعین میں حماد الروایتیہ اور خلف بن حیان الاحمر زیادہ مشہور ہیں۔ ایک مرتبہ ولید بن یزید نے حماد سے پوچھا، تمہیں کتنے اشعار یاد ہیں بولا، بہت زیادہ۔ اگر آپ سُننا چاہیں تو ایک نشست میں ہی ہر حرف تہجی کے سو سو طویل قصیدے صرف شعراء جاہلیت کے سنا سکتا ہوں، ظاہر ہے کہ حماد کا یہ عجیب و غریب دعویٰ خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ شعراء جاہلیت کی طرف منسوب کر کے جو اشعار سنا تا تھا ان میں بہت کچھ اُسکے خود ساختہ و پرداختہ اشعار بھی شامل ہوتے ہونگے۔ چنانچہ صہمی نے ایک مرتبہ کہا، حماد اعلم الناس ہے۔ اگر وہ اشعار میں کمی بیشی نہ کرے، علامہ یا قوت الطوسی لکھتے ہیں کہ

اصحی نے یہ اسلئے کہا کہ حماد کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ وہ شعراز خود کہتا ہے اور پھر شعرا عرب کی طرف اسے  
 منسوب کر دیتا ہے۔ "مفضل الضبی کا قول ہے "شعر پر حماد کی وجہ سے ایسی آفت لڑی ہے جو جکی کبھی اصلاح  
 نہیں ہو سکتی، یہ شخص قدیم شاعروں کے محاورات، انداز بیان اور ان کے لغات و اسلوب ادا سے پوری  
 طرح واقف تھا۔ اسلئے ان کے ہی طرز میں شعر کہ کر انکی طرف منسوب کر دیتا تھا۔ اور سوائے ماہر فن نقاد  
 کے عام لوگوں کو امتیاز نہیں ہو سکتا تھا کہ اس قصیدہ میں کتنے شعرا کے ہیں اور کتنے خود حماد کے  
 کہے ہوئے ہیں۔" ۱۵۵ء میں انتقال ہوا۔

یہی حال خلف الاحمر کا تھا، اس کا باپ ابو بردہ بلال بن ابی موسیٰ الاشعری کا غلام تھا، اشعار  
 کے وضع میں یہ حماد کا ہم پارہ تھا۔ کتاب "ابن الروادۃ" میں ہے کہ یہ شخص آنا بڑا حاذق اور ماہر لغت  
 ادب تھا کہ اپنے اشعار شعرا جاہلیت کے نام سے پڑھ کر سنا دیتا تھا۔ اور بڑے بڑے زبان دانوں  
 کو یہ محسوس نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ اشعار خود اسکے طبع اور اسے ابو الطیب عبدالواحد اللخومی کا بیان ہے۔

كَانَ خَلْفٌ يَضَعُ الشَّعْرَ وَيُنْسِبُهُ  
 خلف اشعار وضع کرتا تھا اور انھیں عرب کی طرف

الی العرب فلا یعرف  
 منسوب کر دیتا اور (لطف یہ ہے) اسکا پتہ نہیں چلتا تھا

ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ چونکہ قرآن نے اپنی غیر معمولی فصاحت و بلاغت کے باعث تمام عرب  
 کے دلوں کو مسح کر لیا تھا۔ پتہ پتہ کی زبان پر قرآن کی آیتیں تھیں جنھیں بے تکلف بول چال اور  
 تقریر و خطابت میں استعمال کر کے اپنے کلام کو مزین کرتے تھے۔ انداز خیال۔ اسلوب بیان اور طرز کلام  
 و گفتگو قرآن مجید کے نظم کلام سے متاثر تھے اس بنا پر یہ قیاس کرنا بالکل صحیح ہے کہ حماد الراویہ اور  
 خلف الاحمر ایسی وضع و قماش کے لوگ اپنے جن نتائج فکر کو قدیم شعرا عرب کی طرف منسوب کرتے تھے

۱۵۵ ایضاً ص ۲۶۵، ۲۶۶

۱۵۵ معجم البلدان ج ۱۰ ص ۲۶۵ جدید ادیشن

۱۵۵ معجم البلدان ج ۱۱ ص ۶۸



ان میں قرآن مجید کے اسلوب بیان کی جھلک اضطراری یا اختیاری طور پر نمایاں ہو جاتی تھی ہم تمثیلاً  
تین شعر نقل کرتے ہیں جو بالعموم امیہ بن اصفحت کی طرف منسوب ہیں۔ انھیں پڑھو اور غور کرو، صاف  
معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے قرآن مجید سامنے رکھ کر یہ اشعار تصنیف کئے ہیں۔

فقلت لہ اذہب بھارون فادعوا      الی اللہ فرعون الذمی کان طاعنیاً  
وقولاکہ انت رفعت ہذہ      بلا عہد ارفق اذا بک بانیا  
وقولاکہ انت سویت وسطہا      منیراً اذا ماجتہ اللیل ہادیاً

ان اشعار کے ساتھ قس بن ساعدہ کے خطبہ کا ایک ٹکڑا بھی ملاحظہ فرمائیے۔ کتاب ہے۔  
نبیاً قدحان حنیئہ، واطلکم اوانہ، فطوبی لمن آمن بہ فہداه وویل لمن خالفہ وعصاه  
جو لوگ زبان عربی کا ذوق رکھتے ہیں وہ فوراً محسوس کر لیں گے کہ اس عبارت میں جو الفاظ قرآن  
مجید کے آگے ہیں ان کا دوسرے الفاظ کے ساتھ جوڑ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ٹاٹ میں منجھل کے  
کسی ٹکڑے کا پیوند اور اس بنا پر پوری عبارت صاف بتا رہی ہے کہ یہ نزول قرآن سے پہلے کی  
ہیں بلکہ بعد کی ہے۔

عجیب بات یہ ہے کہ پروفیسر مارگولیوتھ اس قسم کے معترضین میں سب سے پیش پیش ہیں مگر  
ایک جگہ خود انھیں بھی اعتراف ہے کہ "قدیم شاعری کا اکثر حصہ قرآن کے اسلوب پر موضوع کیا گیا ہے  
اشعار موضوعہ کی تنقید جس طرح مسلمانوں میں بعض شریرانفس لوگوں کی کوششوں سے احادیث موضوعہ  
کا چرچا ہوا تو اب باب فن نے ان کا تار و پود بکھیر کر رکھ دیا اور ایک ایک لفظ اور ایک راوی پر  
ایسا نقد و جرح کیا کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو گیا۔ اسی طرح اس قسم کے من گھڑت اشعار

۱۰ اللالی المصنوعہ فی الاحادیث الموضوعہ للسیوطی ج ۱ ص ۲۸ مطبوعہ مصر

۱۱ بحوالہ سیرۃ النبی ج ۱ حاشیہ صفحہ ۱۸۳

اور خطبے شعراء و خطباء قدیم کی طرف منسوب ہو کر مسلمانوں میں پھیلنے شروع ہوئے تو اگرچہ عوام اصلی اور  
 میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن اصحاب ذوق اور علماء شعر و ادب اس فریب میں نہیں آسکے  
 انہوں نے علماء جرح و تعدیل کی طرح ان موضوع اشعار و قصائد کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھا اور  
 میں جہاں کہیں زحمت نظر آیا اسے بر ملا ظاہر کیا۔ چنانچہ ابن ہشام نے اپنی سیرت میں اور جلال  
 سیوطی نے اللآلی المصنوعہ میں اس نوع کے اشعار و خطبات متعدد مواقع پر نقل کر کے ان پر تنقید  
 ہے اور ان کے موضوع ہونے کا پردہ چاک کیا ہے۔ ان کے علاوہ عربی ادب کی تنقید  
 میں بھی اس طرح کے مقولے اور اقوال بکثرت مل سکتے ہیں

پھر اس پر بھی غور کرنا چاہئے کہ اگر عیسائی مصنفین کا یہ اعتراض کسی درجہ میں بھی درج  
 ہوتا تو اس کی طرف سب سے پہلے توجہ ان کفار و مشرکین کو ہوتی جو انتہائی عالم بے بسی و  
 قرآن پر حرف گیری کرنے کے لئے تنکے کا سہارا ڈھونڈتے تھے۔ تو پھر کیا یہ حیرت کی بات  
 کہ جو لوگ اہل زبان تھے شعراء جاہلیت کا کلام جن کے ایک ایک کلمہ کی زبان پر تھا  
 زبان کے اسالیب بیان سے واقف ہونے کے باعث شعراء عرب پر بہترین تنقید  
 ان کے حاشیہ خیال میں تو یہ بات کبھی بھی نہیں آئی کہ قرآن مجید کا اسٹائل شعراء و خطباء جاہلیت  
 اسٹائل سے ماخوذ ہے اور وہ عیسائی مصنفین جن کا ذوق عربیت اور مسلمانوں کے  
 سے ان کی واقفیت برائے نام ہی ہے وہ اس بے سرو پا اعتراض کی جرأت کرتے ہیں

پرمی ہفتہ رخ دو یو در کر شہہ و ناز

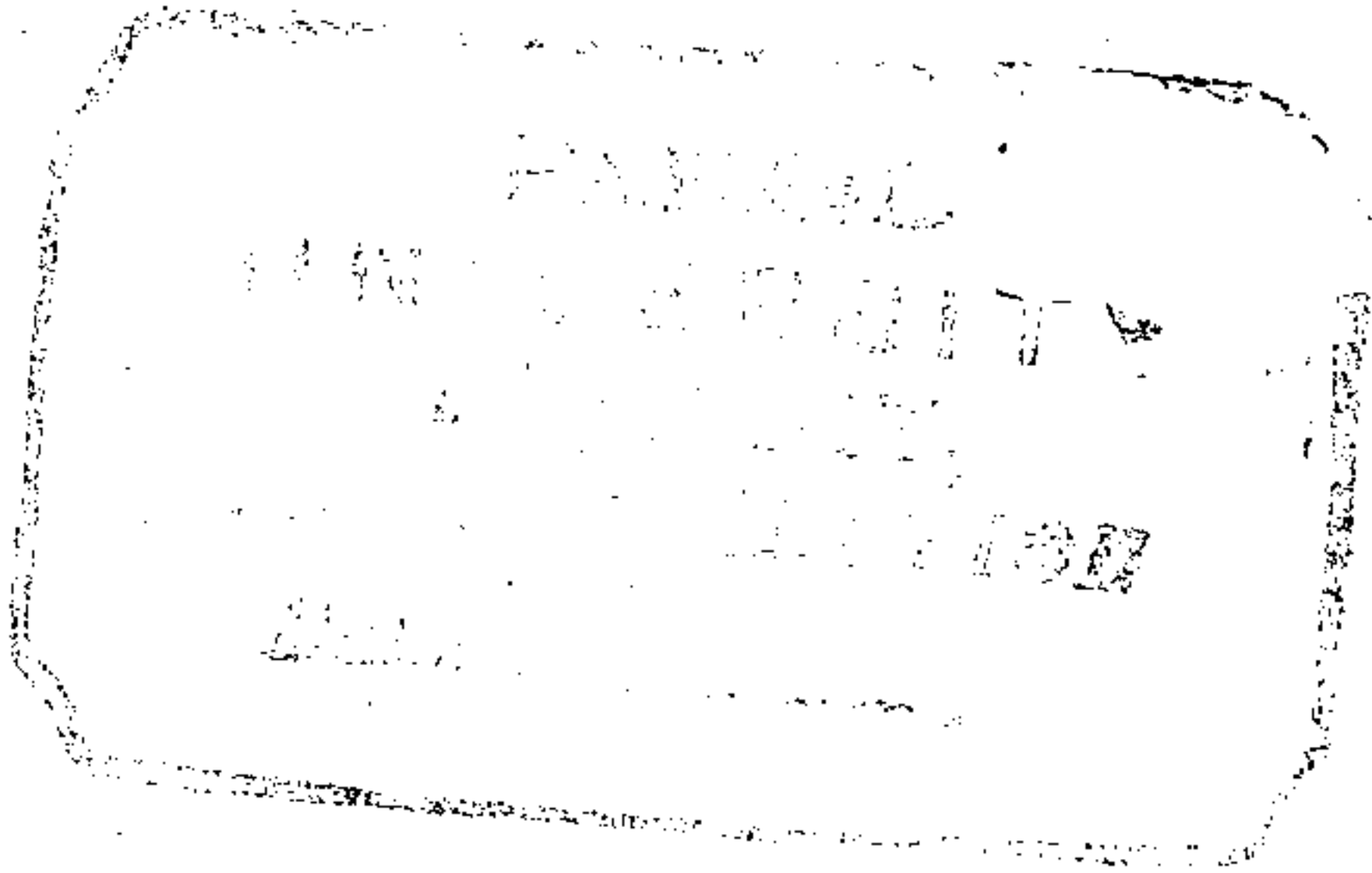
لبوخت عقل ز حیرت کہ اس چہر بولعجبی ست

سیاتلہ ندوۃ المصنفین دہلی

(۱۱)

DATA ENTERED

# وہی الہی



تالیف  
سعید احمد ایم، ایے